دَخمہ
بیگ احساس

دَخمہ
بیگ احساس

دَخمہ

افسانے

بیگ احساس

عرشیہ پبلیکیشنز، دہلی۔ ۹۵

(c) پروفیسر بیگ احساس

نام کتاب : دَخمہ(افسانے)
مصنف : بیگ احساس
پتہ: # 8-1-398/PM/416, Yaser Enclave, Flat No. 401
Paramount Hills, Tolichowki, Hyderabad - 500 008
ای میل : baigehsas@gmail.com
مطبع:
سرِورق:
کمپوزنگ : محمد حسن الدین صوفیانی

DAKHMA (Short Stories)

By: Baig Ehsas

Edition: 2015 Rs. 200/-

ملنے کا پتہ:
☆ مکتبہ جامعہ لمیٹیڈ، اردو بازار، جامع مسجد، دہلی، ۶
☆ کتب خانہ انجمن ترقی اردو، جامع مسجد، دہلی، ۶
☆ رائی بک ڈپو، ۷۳۴ اولڈ کٹرہ، الہٰ آباد
☆ ایجوکیشنل بک ہاؤس، علی گڑھ
☆ بک امپوریم، اردو بازار، سبزی باغ، پٹنہ
☆ کتاب دار، ممبئی
☆ دانش محل، جھنڈے والا پارک، امین آباد، لکھنؤ
☆ ہدیٰ بک ڈسٹری بیوشن، حیدرآباد
☆ مرزا ورلڈ بک، اورنگ آباد
☆ عثمانیہ بک ڈپو، کولکاتہ
☆ قاسمی کتب خانہ، جموں توی، کشمیر

Arshia Publications

A-190, Ground Floor-3, Surya Apartment, Dilshad Colony, Delhi - 110096 (India)
Mob: +91 9971775969 +91 9899706640 Email: arshiapublicationspvt@gmail.com

انتساب

والد محترم مرزا خواجہ حسن بیگ صاحب

کی نذر

آٹھ برس کی عمر میں جن کے سائے سے محروم ہونا پڑا

اور اگر

خدا چاہے تو ادھورے قصے بھی پورے کر دیتا ہے۔

فہرست

ہر سنگ و خشت ہے صدف گوہر شکست
نقصاں نہیں جنوں سے جو سودا کرے کوئی

(غالبؔ)

ابتدائیہ

بیگ احساس کے افسانوں کے تیسرے مجموعے: ''دَخمہ'' کے سارے کے سارے افسانے، افسانہ نگار کی اس انوکھی تدبیر کاری کی عطا ہیں، جسے بیسویں صدی کے ساتویں دہے سے مخصوص جدیدیت کے تحریک کے رد میں اٹھنے والی آوازوں کا ردّعمل بھی قرار دیا جا سکتا ہے اور تخلیقی سطح پر جینے کا جتن بھی۔ وہ یوں کہ بیگ احساس کا تعلق بھی ستر ہی کے دہے سے ہے، لیکن وہ جدیدیت کی تحریک سے الگ تھلک رہے۔ نہ 'شب خون' الہ آباد میں دکھائی دیئے، نہ اوراق، لاہور میں لیکن انھیں صرف و محض سادہ بیانیہ کبھی نہیں بھایا۔ یہی سبب ہے کہ انھوں نے سیدھے سبھاؤ تشکیل دیئے گئے بیانیہ کے اندر پرت در پرت کئی ایک تہیں جما کر کامل علامتی، استعاراتی، کیوبسٹک اور تجریدی افسانہ لکھنے کی بجائے ایک ایسا تہہ دار بیانیہ تشکیل دیا، جس میں معنویت کی کئی ایک پرتیں دیکھنے کو ملتی ہیں۔

بیگ احساس کے اس جتن کو قدرے پیچھے ہٹ کر دیکھنا پڑے گا، جب ستّر کے دہے میں میرے ہم راہی: رشید امجد، منشایاد، اسد محمد خاں، ظہور الحق شیخ، مظہر الاسلام، احمد داؤد، علی تنہا، ذکاء الرحمٰن پاکستان میں اور سلام بن رزاق، نیر مسعود، قمر احسن، انور قمر، علی امام اور عبد الصمد بھارت میں، علامتی، استعاراتی، اور تجریدی افسانہ لکھ رہے تھے۔ تب ترقی پسند تحریک کی نمائندہ آواز عصمت چغتائی نے استہزایہ: ''سانپ کے تلوے'' اور غیر وابستہ افسانہ نگاروں کے سرخیل ممتاز مفتی نے افسانہ: ''کٹ پیس'' لکھ کر ہم لوگوں کا مضحکہ اڑایا تھا۔ احمد ندیم قاسمی نے مجلّہ: ''فنون'' لاہور میں سیفٹی والو لگا رکھا تھا، علامت، استعارے اور تجرید پر اور ہمارے افسانوں کے مقابل انھیں تیسرے درجے کے سادہ بیانیہ افسانے مرغوب تھے۔ یہی کچھ نقوش، لاہور اور 'نیا دور' کراچی میں دیکھنے کو ملتا تھا۔ ہمارے افسانوں کی اگر پذیرائی ہوئی تو 'شب خون' الہٰ آباد، اوراق، لاہور، سیپ، کراچی اور نئی قدریں، حیدر آباد (سندھ) میں۔ یا پھر، جواز، مالی گاؤں، شاعر، ممبئی، تحریک، دہلی، اسلوب، سہسرام، تخلیقی ادب، کراچی اور جہات، سری نگر نے اردو افسانے میں تکنیکی تجربات کو کھلے دل سے قبول کیا۔ اس کے بعد ترقی پسند تحریک کے گریٹ ماسٹرز کے چیدہ کام اور پانچویں چھٹے دہوں کے افسانہ نگاروں کے انگلیوں پر گنے جا سکنے والے افسانوں ''چاپ'' (رام لعل) 'سائے اور ہمسائے' اور پرندہ پکڑنے والی گاڑی، (غیاث احمد گدّی)، بیلا نائی رے جولدی جولدی، اور ڈاب اور بیئر کی ٹھنڈی بوتل، (مسعود اشعر)، سوکھے ساون، اور پچھّم سے چلی پُروا، (ضمیر الدین احمد)، کو چھوڑ کر جدید افسانہ اس دور کے بڑے بڑے ناموں کو کھا گیا۔ اکثر نے تو لکھنا ہی چھوڑ دیا۔ یہاں تک کہ وہ وقت بھی آیا جب جدید افسانے کے سب سے بڑے اعتراض کنندہ ممتاز مفتی نے ''چکٹ گاڑی'، ہونکتا ہوٹر اور موم بتی'' کے عنوان سے پہلا علامتی اور تجریدی افسانہ قلم بند کیا، جو جدید ادب، خان پور کے افسانہ نمبر بابت فروری ۱۹۸۰ء میں رشید امجد، احمد داؤد اور میرے افسانوں کے ساتھ شائع ہوا۔ اس افسانے کے بعد انھوں نے ''چوہا'' اور ''روغنی پتلے'' کے عنوانات

سے دو علامتی افسانے اور لکھے اسی طرح احمد ندیم قاسمی نے اپنا پہلا علامتی افسانہ ''پہاڑ'' کے عنوان سے لکھا جوان کے آخری افسانوں میں سے ایک ہے۔ اشفاق احمد کے تین علامتی افسانے ''قصہ نل دمتی''، ''بندر لوگ'' اور ''قصاص'' لکھے۔ رحمان مذنب کا ''خوشبودار عورتیں'' اور بانو قدسیہ کا ''انتر ہوت اداسی'' بھی اسی دور کی یادگار ہیں۔

مجھے سمجھ میں نہیں آتا کہ صرف و محض ناقدین سے ڈر کر تخلیق کار نئے امکانات سے ہاتھ کیسے روک لیتا ہے۔ بیسویں صدی کے آٹھویں دہے کے بعد ایسا کچھ بھی دیکھنے کو ملا، جب ڈاکٹر جمیل جالبی کا علامتی، استعاراتی اور تجریدی افسانے کے خلاف ''اوراق'' لاہور میں شائع شدہ واحد مضمون شائع ہوا، جس میں ابلاغ کے عنقا ہو جانے کا دکھڑا اس شد و مد کے ساتھ رویا گیا کہ افسانہ بھوسے کا ڈھیر ہو کر رہ گیا۔ کثیر العباد افسانے کی جگہ سیدھی سادہ کہانی سے مخصوص یک سطحی سادہ بیانیہ نے لے لی۔ جب کہ آٹھویں دہے سے متعلق ایک استثنائی مثال سید محمد اشرف (افسانوی مجموعہ ''باد صبا کا انتظار'') کی ہے۔ سبحان اللہ! کیا افسانے لکھے انھوں نے کہانی پن کی جستجو میں دُبلے ہو جانے والے افسانہ نگار، جید ناقدین کو لبھانے کی خاطر یک سطحی سادہ بیانہ لکھ رہے ہیں اور نہیں جانتے کہ انھیں صرف و محض زبانی شاباشی ہی میسر آئے گی اس لیے کہ کوئی بھی ناقد بھوسے کے ڈھیر پر مہر تصدیق کرے تو کیسے؟

بیگ احساس کے افسانوں پر بات کرنے سے پہلے یہ چند معروضات اس لیے بھی ضروری خیال کیں کہ ساتویں دہے میں اپنے عروج کو پہنچ جانے والی جدیدیت کی تحریک اور بیسویں صدی کے آٹھویں دہے کے وسط تا حال اسے رد کرنے والے پینتیس سالہ دورانیے کے تجزیہ میں آسانی رہے۔

بیگ احساس کا تعلق بھی میری طرح اسی مقہور و مردود ستر کی دہائی سے ہے، جس میں جدید افسانہ نگار بھارت کے فیروز عابد، مظہر الزماں خاں، حسین الحق، شوکت حیات، حمید سہروردی،

انور خاں، انجم عثمانی اور شفق بھی متحرک دیکھے گئے، نیز اکرام باگ تھے، جنھوں نے کیوبسٹک طرز کو اپنایا اور یکسر نا کام رہے۔ فرق صرف اتنا ہے کہ بیگ احساس نے پانچ، چھے برس بعد افسانہ نگاری شروع کی اور اپنے لیے علامت، استعارہ اور تجرید کی بجائے کچھ الگ بطور Tool کے برتا، وہ ''الگ'' کیا تھا، اس پر بھی بات کرتے ہیں لیکن پہلے ایک اعتراف، اور وہ یہ کہ میں اس مجموعے میں شامل افسانے ''رنگ کا سایہ''، ''دَخمہ''، ''نمی دانم کہ''، ''دھار'' پڑھ کر یکسر حیران رہ گیا اور بارہا افسوس کیا کہ بیگ احساس کے افسانے اس وقت میری نظر سے کیوں نہ گزرے، جب میں ''افسانے کا منظر نامہ'' (طبع اول ۱۹۸۱ء) پر ۱۹۷۵ء تا ۱۹۷۷ء کام کر رہا تھا۔ بیگ احساس، بلا شبہ ایک قابل توجہ افسانہ نگار ہیں۔ ان کے افسانوں پر ایک سرسری نظر بھی ڈالی جائے تو بھی ان کے افسانوں سے مخصوص جداگانہ ٹریٹمنٹ اور عہد موجود سے متعلق گہرا ادراک اور فراست کا ایک ایسا تال میل دکھائی دے گا، جس کے درج ذیل زمرے بنائے جا سکتے ہیں۔

۱) ماضی سے حال اور لمحہ موجود سے ماضی قریب اور ماضی بعید میں اُتر جانے کا عمل، افسانہ ''دَخمہ''، ''رنگ کا سایہ''، ''کھائی'' اور ''سنگ گراں''

۲) پرانی اور نئی نسل کا ٹکراؤ کئی ایک سطحوں پر دیکھنے کو ملتا ہے۔ آزاد خیالی اور مذہبی جنونیت، نیز تہذیبی اقدار سے جڑت اور بے گانگی آپس میں ٹکراتے اور ٹوٹ کر شہاب ثاقب کی طرح جلتے بجھتے دکھائی دیتے ہیں جس کی نمایاں امثال ''دَخمہ''، ''رنگ کا سایہ''، ''نمی دانم کہ'' اور ''دھار'' جیسے افسانے میں۔

۳) سب سے بڑا ٹکراؤ حیدرآباد (دکن) کے مسلم گھرانوں کے احساس تفاخر اور عصر نو کی نوجوان نسل کی معاشی الجھنوں سے پیدا شدہ سوچ کے بیچ ہے۔ (مثال: کھائی) اسی طرح ان کے شاہکار افسانے ''رنگ کا سایہ'' کا نوجوان مرکزی کردار اسی ٹکراؤ کے سبب ڈانواں ڈول ہے۔ جائے تو کدھر جائے۔

دیکھیے، ہر قابل توجہ قلم کار کی ایک اپنی تخلیقی شخصیت ہوتی ہے، جو اس کی تخلیقات میں جھلکتی ہے۔ کبھی واشگاف اور بعض اوقات پس پردہ۔ یہ دیکھا دیکھی کا عمل نہیں۔ اب بات کو ستر ہی کے دہے کے چند افسانہ نگاروں کی امثال سے واضح کر دوں۔ رشید امجد نے علامت نگاری تو کی، لیکن انھوں نے جس نوع کا تشبیہاتی انداز اپنے تجریدی افسانوں میں برتا، اس کا پرتو ہمیں منشا یاد، حمید سہروردی، اعجاز راہی، طاہر نقوی اور احمد داود کے ہاں بھی دیکھنے کو ملا۔ منشا یاد اور احمد داود نے اس سے کنارہ کر کے ہی اپنی اپنی شناخت وضع کی، جب کہ دیگر افسانہ نگاروں کو اس کا احساس تک نہ ہوا۔ نتیجہ ظاہر ہے۔

بیگ احساس، اپنے ہر افسانے میں اپنے علاقائی حوالوں اور نسبتوں کے ساتھ موجود دکھائی دیتے ہیں۔ ان کے علاقائی حوالے حیدرآباد (دکن) سے متعلق سبھی قلم کاروں سے جداگانہ ہیں ماسوائے مکالماتی سطح پر اور نسبتیں، حیدرآبادی انگ کے۔ بول چال کی سطح پر یہ انگ تو نہیں بدلے گا، جیسے مغربی پنجاب سے مخصوص لہجہ، جو احمد ندیم قاسمی، غلام الثقلین نقوی اور منشا یاد کے ہاں یکساں ہے اور مشرقی پنجاب کا لہجہ، جو راجندر سنگھ بیدی، بلونت سنگھ اور رتن سنگھ کے ہاں یکساں ہے۔

بیگ احساس کی اصلی طاقت وہ علاقائی حوالے اور نسبتیں ہیں، جنھوں نے انھیں جدیدیت کی تندندی سے بھی دور رکھا اور اکہرے بے رس بیانیہ سے بھی۔

مجموعہ ''دَخمہ'' میں شامل ہر ایک افسانے میں کچھ نہ کچھ ایسا ضرور ہے جو 'خاص' ہے جس کا تعلق ہمارے تہذیبی منطقے سے بھی ہے اور اکیسویں صدی کی کروٹیں لیتی زندگی سے بھی۔ ان افسانوں میں موجود گہری فراست، کسی نہ کسی معمول کی بات کے اندر سے پھوٹتی ہے اور پھر رفتہ رفتہ پھیل کر اس معمول کی بات کے گرد ایک ہالہ سا بن دیتی ہے۔ یہ خود رو عمل اندر ہی اندر، نامحسوس طور پر ہوتا ہے اور یوں معمول کی بات، غیر معمولی اور بالآخر بے مثل بن جاتی ہے۔ جیسے افسانہ ''دَخمہ''

میں آزادی (۱۹۴۷ء) کے بعد بڑھتی ہوئی مذہبی لہر کیا اٹھی، ایک پارسی سہراب کا پشتینی میکدہ (MAI KADA Est.ء 1904) مسجد سے ہمسائیگی کے سبب بند ہو گیا۔ یہ فی زمانا ایک معمول کی بات ہے۔ لیکن کیا سہراب کی موت کا یہی سبب تھا یا کچھ اور؟ پھر یہ کہ کسی بھی ذی روح کی موت ایک معمول کی بات ہے۔ غیر معمولی اس وقت بنی جب پتا چلا کہ میکدہ ۱۹۰۴ء میں قائم ہوا تو اس کے برابر میں مسجد تھی۔ تادیر دونوں موجود رہے۔ اب میکدہ بند ہو گیا۔ کیوں؟ مسجد تو پہلے بھی تھی۔ یہ پہلے کیوں نا بند ہوا۔ وقت نے کروٹ لی۔ لوگوں میں رواداری ختم ہو گئی۔ سہراب کے پاس اللہ کا دیا بہت ہے۔ میکدے کے بند ہو جانے سے اسے کوئی فرق نہیں پڑتا۔ تو کیا رواداری کا ختم ہو جانا اس کی موت کا سبب بنا؟ جب یہ سوال اٹھا تو بات کہیں سے کہیں پہنچ گئی۔ پارسیوں کی نسل تو یوں بھی ختم ہوتی جا رہی تھی۔ کیا اسی مرحلے پر میکدہ بند کروا دینا ضروری تھا؟ یہ سوال اسی تہذیبی رواداری کی کوکھ سے جنم لے سکتا ہے جو کبھی تھی اور اب نہیں رہی۔

دَخمہ گاتھی (Gothic) طرز تعمیر کا افسانہ ہے، جس میں عقائد، رسومات، روایات، تاریخ، سیاست اور انسانی روابط کے متعلقات کی محرابیں اک دوجے میں پیوست ہیں۔ اس افسانے میں جس فراست کے ساتھ حیدرآباد میں ملوکیت کے خلاف چلنے والی کمیونسٹوں کی تلنگانہ تحریک اور آزادی (۱۹۴۷ء) کے بعد پولیس ایکشن، نیز زبان کی بنیاد پر ریاستی حد بندیوں کا حوالہ دیکھنے کو ملتا ہے، اس طرح تو ابراہیم جلیس کی لانگ فکشن: ''دو ملک، ایک کہانی'' میں بھی دیکھنے کو نہ ملا:

> ''پولیس ایکشن نے مسلمانوں کو حواس باختہ کر دیا تھا۔ مذہب کے نام پر ملک کی تقسیم سے پوری قوم سنبھلی بھی نہ تھی کہ زبان کی بنیاد پر ریاستوں کی نئی حد بندیاں کی گئیں۔ ریاست کے تین ٹکڑے کر دیئے گئے۔ برسوں گزر جانے کے بعد بھی دوسری

ریاستوں سے جڑے یہ ٹکڑے ان کا حصہ نہ بن سکے۔اپنی مستحکم تہذیب کی بنیاد پر ریاست کے یہ حصے ٹاٹ میں مخمل کے پیوند لگتے تھے۔

جس شہر کی تاریخ نہیں ہوتی اس کی تہذیب بھی نہیں ہوتی۔نئے آنے والوں کی کوئی تاریخ تھی نہ تہذیب ایک مستحکم حکومت کا دارالخلافہ سیاسی جبر کی وجہ سے ان کے ہاتھوں میں آ گیا۔وہ پاگلوں کی طرح خالی زمینوں پر آباد ہو گئے۔

زمین بیچنا یہاں کی تہذیب کے خلاف تھا۔شرما شرمی میں قیمتی زمینیں کوڑیوں کے مول فروخت کر دی گئیں۔آنے والے زمینیں خرید خرید کر کروڑ پتی بن گئے۔

کسی کوٹھی میں صدر ٹپہ خانہ آ گیا، کسی حویلی میں انجینئر نگ کا آفس، کسی حویلی میں اے جی آفس تو کسی حویلی میں بڑا ہوٹل کھل گیا۔ باغات کی جگہ بازار نے لے لی۔ لیڈی حیدری کلب پر سرکاری قبضہ ہو گیا۔کنگ کوٹھی کے ایک حصے میں سرکاری دواخانہ آ گیا۔جیل کی عمارت منہدم کر کے دواخانہ بنا دیا گیا۔رومن طرز کی بنی ہوئی تھیٹر میں اب بہت بڑا مال کھل گیا تھا۔حویلیاں، باغات، جھیلوں اور پختہ سڑکوں کے شہر کی جگہ دوسرے عام شہروں جیسا شہر ابھر رہا تھا جس کی کوئی شناخت نہ تھی۔"

پارسی گٹہ، کی تفصیل اور میت سے متعلق پارسی رسوم و رواج کی تفصیل بھی حیران کن

ہے۔افسانہ نگار، اپنے ہر افسانے میں اس نوع کی حیرانی بانٹتے چلے آئے ہیں لیکن طریقہ کار کے فرق کے ساتھ اس افسانے میں یہ کام شعور کی روکو مہارت کے ساتھ برت کر کیا گیا۔ یوں ماضی اور حال اپنی تمام تر جزئیات کے ساتھ افسانے کا حصہ بنتے ہیں۔

''یہ دَخمہ ہے۔ اس کی چھت درمیان سے اونچی ہوتی ہے۔ چھت پر تین دائرے بنے ہیں۔ مرد کی نعش اندرونی دائرے میں، عورت کی درمیانی دائرے میں اور بچوں کی نعش اندرونی دائرے میں رکھی جاتی ہے تاکہ ان پر تیز دھوپ پڑے اور گدھوں کو دور سے نظر آجائے......... اسے سگ دید کہتے ہیں۔چار آنکھوں والا کتا......... یہ سگ دید ہی آدمی کے نیک و بد ہونے کا فیصلہ کرتا ہے۔''اور چاچا یہ گدھ کہاں سے آتے ہیں؟''،''اگر فرش پھر چینی گر جائے تو چیونٹیاں کہاں سے آتی ہیں؟'' چاچا نے سوال کیا اور اندر چلے گئے۔''

زمانے کس طرح کروٹ لے رہا ہے؟ اس کی تفصیل نہایت عمدگی سے اس دورانیے میں بیان کی گئی ہے، جب سہراب کے اعزاء اور چند ایک شناسا دَخمہ کے اندر سہراب کی آخری رسومات میں مصروف رہے۔

میکدے میں بیٹھنے والا ایک ساتھی، جو امریکہ جا بسا تھا، بیس برس بعد لوٹ کر آیا تو حد درجہ ناسٹالجک ہو گیا تھا۔ پارسی گٹھ کے اندر تعمیر کردہ دَخمہ کی چھت پر سے جب تک گدھ، سہراب کی برہنہ نعش کو نوچ کر لے جائیں، افسانہ نگار ہمیں افسانہ کے راوی اور اس کے امریکہ پلٹ دوست کے ہمراہ سہراب کے گھر لے گئے۔ یہ ماضی قریب کی بات ہے جو حال کے بے رحم لمحات سے آکر جڑ گئی ہے اور پارسی گٹھ میں سہراب کی آخری رسومات جاری ہیں۔ معلوم ہوا کہ حیدرآباد آکر بس

جانے والے پارسی، سیکولر آصف جاہی سلطنت کے چرچے سن کر آئے تھے۔ یہاں انھیں خطابات سے نوازا گیا، نواب سہراب نواز جنگ، فرام جی جنگ، فریدون الملک، وہ شاہی دور تھا۔ آزادی ملی اور جمہوریت آئی تو اس رواداری کا خاتمہ ہوا۔ مسلمانوں کی شکایت پر میکدہ بند کر دیا گیا۔

پارسیوں کے گھٹ جانے کے سبب اب تو دَخمہ کی چھت پر گدھ بھی نہیں منڈلاتے۔ سہراب خوش نصیب تھا کہ جب اس کی برہنہ نعش دَخمہ پر رکھی گئی تو دور دور تک گدھوں کا نام ونشان نہ تھا، پر جانے کہاں سے گدھوں کا ایک جھنڈ دَخمہ کی طرف لپکا۔ بے شک، فرش پر چینی گر جائے تو چیونٹیاں آ ہی جاتی ہیں۔

افسانہ دَخمہ میں جس سوچ نے مسجد کی ہمسائیگی کے سبب میکدہ بند کروایا، وہی سوچ اب جنوبی ایشیاء کے مسلم گھرانوں کے دروازوں پر مہیب دستک بن گئی ہے۔ نائن الیون کو امریکن ٹریڈ سنٹر کی دو فلک بوس عمارات پر القاعدہ کے حملے نے عالمی معیشت، سیاست اور سوچ کے ڈھروں کو ایک نئی کروٹ دے دی۔ عراق اور افغانستان اتحادی افواج کا نشانہ بنے تو اس کا ردِعمل بالخصوص سوات اور فاٹا (پاکستان) اور مجمل طور پر ایران میں بہت شدید تھا۔ ہندوستان جیسا سیکولر جمہوری ملک بھی اس کی تپش سے جھلسا۔ بابری مسجد کے سانحے کا ردِعمل پاکستانی میں بہت شرمناک تھا۔ یوں تو ۱۹۴۷ء کے فسادات کے نتیجہ میں ہندوؤں اور سکھوں کے ہجرت کر جانے کے سبب پاکستان میں مندروں اور گوردواروں کو تالے پڑ گئے تھے، لیکن وہ زنگ آلود تالے بھی کہاں گوارا رہے۔ بڑی تعداد میں مندر گرا دیئے گئے، یہاں تک کہ لاہور کا جین مندر بھی۔

ہجوم کی بپھری ہوئی نفسیات عجب ہے۔ فائر بریگیڈ نے جب پشاور کے ایک چرچ سے اٹھنے والی آگ بجھا دی تو اگلے روز اس چرچ کے آگ میں جھلسے ہوئے دروازے پر ایک بورڈ آویزاں دیکھا گیا۔ جس پر لکھا تھا:

''یہ وہ عبادت گاہ ہے، جس میں پاکستان کی سلامتی کی دعا مانگی جاتی تھی۔''

بیگ احساس نے ایسے میں افسانہ ''دھار'' کی صورت ہندوستان کا درجہ حرارت نوٹ کروانے کو ایک بہت معمولی سی بات کو چنا۔ جو ابتدا میں تو معمولی تھی، لیکن آخر کار غیر معمولی بن گئی۔ ایک ریٹائرڈ مسلم، جس نے ریٹائرمنٹ کے بعد نہ داڑھی بڑھائی، نہ تسبیح ہاتھ میں لے کر مسجد کا رخ کیا، اس وقت مخمسے میں پڑ گیا جب حسب معمول صبح اٹھ کر اس نے شیو بنانا چاہی تو اسے اس کی شیونگ کٹ مخصوص جگہ پر رکھی ہوئی نہ ملی۔ بس اتنی سی بات تھی۔

اس کے بیٹے نے سیاہ شرعی داڑھی رکھ چھوڑی تھی، جو اس کے لیے ناگوار خاطر تھی۔ کٹر مذہبیت کی اپنے ہی گھر سے اٹھنے والی لہر اس کے لیے ایک مشکل بنتی جا رہی تھی۔ اس سے ایک ایسے ناسٹالجیا نے جنم لیا جو ہندوستان کی گنگا جمنی تہذیب کے کھو جانے سے متعلق ہے سب مٹتا جا رہا ہے، یہ عمل کیسے تھمے؟ جو مٹ گیا، اس کی بازیافت کیوں کر ہو؟

اس نے کبھی ایک لمحے کے لیے بھی نہیں سوچا کہ خود اپنے یا اپنے بچوں کے مستقبل کو محفوظ بنانے کی خاطر کسی یورپی ملک میں چلا جائے۔ اسے یہ گوارا نہیں کہ محض روپے پیسے کی خاطر دوسرے درجے کا شہری بن جائے۔ جب کہ اس کی اگلی نسل ایسا کچھ ہی چاہتی تھی اور یہ اس کے لیے سوہان روح بنتا جا رہا تھا۔

اس نے اپنا آبائی گھر اس لیے چھوڑا کہ وہاں رفتہ رفتہ پنپنے والی مذہبی منافرت، اس کی طرز زندگی پر کھلے طنز میں ڈھلنے لگی تھی۔ اس سے پہلے کہ طنز، قتل و غارتگری میں ڈھلے، چھوڑ دیا اس نے وہ علاقہ اور اٹھ آیا، خالص مسلم آبادی میں جہاں ہر نکڑ پر لمبے کرتے اور اونچے پاجامے پہنے، سروں پر ٹوپیاں اڑسے لمبی داڑھیوں والے بزرگ تھے۔ یا چلتے پھرتے سیاہ برقعے۔ یہاں مسلمانوں ہی کو راہ راست پر لانے والی تبلیغی جماعت کی ٹولیاں گھر گھر دستک دیتیں۔ پر اس کے معمولات میں کوئی تبدیلی واقع نہ ہوئی البتہ برسوں کے معمولات میں پہلا رخنہ تب پڑا جب اس کی بیوی نے الگ فرش پر بستر بچھا کر سونا شروع کر دیا اور پہلا دھچکہ یہ لگا کہ اس کے بیٹے نے شرعی

داڑھی رکھ لی اور روپے پیسے کی خاطر یورپ کا رخ کیا۔ اس نے دل پر پتھر باندھ لیا۔ یہاں تک تو اس میں مزاحمت کی ہمت تھی لیکن غیر معمولی پن نے ایک جست آگے کو تب بھری جب اس کے بیٹے کو اس کے ظاہری حلیے کے پیش نظر یورپ کے ایئرپورٹ سے ہی واپس کر دیا گیا، اس شک کی بنا پر کے اس کی ہیئت کذائی بین الاقوامی دہشت گردوں سے ملتی جلتی تھی۔

کیا ان پر دنیا تنگ ہو رہی ہے؟ یہ وہ سوال تھا، جس کے سامنے اس کے معمولات زندگی کے ہی نہیں، اس کی بچی کچھی مزاحمت کے بخیے ادھڑ گئے۔ ایسے میں جب کئی روز بعد یورپ سے دھتکارے ہوئے بیٹے نے یہ کہتے ہوئے کہ ''صرف داڑھی رکاوٹ بن گئی ہے پاپا..... یہ لیجئے آپ کا سیٹ تو وہ بولا: ''نہیں...... اسے تم ہی رکھ لو۔''

اس نے اپنی من چاہی زندگی گزارنا چاہی تھی، جس میں ناکام رہا۔ کٹر مذہبیت اور فرقہ واریت کی سخت مزاحمت کی لیکن اپنے ہی خون کی شکست، ناکامی اور پسپائی کو دیکھ کر وہ ڈھے گیا۔ اس نے آئینے میں اپنا چہرہ دیکھا، اپنی بڑھی ہوئی داڑھی پر ہاتھ پھیرا اور خیال کیا کہ کچھ بُرا تو نہیں لگ رہا، گوارا ہی تو ہے۔

افسانے کا یہ اختتامیہ لاتعداد سوالات کو جنم دیتا ہے۔ کیا اس کی سوچ غلط تھی؟ کیا بیٹے کی صورت اپنے ہی خون کی یورپ میں Rejection اس کے لیے ناقابل برداشت ہو گئی؟ کیا اس نے بدلے ہوئے حالات کے آگے سر جھکا دیا؟ یا اس کا یہ فیصلہ اپنے جگر گوشے کو اپنی ہی دھرتی سے جوڑے رکھنے کی نئی تدبیر ہے؟ افسانے کو اس درجہ کثیر الجہات بنانا کچھ اتنا ارزاں نہیں۔

افسانہ ''نمی دانم کہ..... '' میں بنیادی قضیہ کیا ہے؟ ایک معمول کی بات قبضہ گروپ نے ایک شریف آدمی کے مکان پر قبضہ کر لیا ہے۔ وہ جو نسلاً مغل ہے، لیکن اس پر کبھی گھمنڈ نہ کیا یونیورسٹی ٹیچر ہے اور اس کا ریٹائرمنٹ قریب ہے۔ اس سے قبل کہ ریٹائرمنٹ ہو جائے اور یونیورسٹی اس سے سرکاری کوارٹر خالی کروالے، اپنا آبائی مکان جو والد گرامی نے کرائے پر اٹھا دیا

تھا، کرایہ داروں سے خالی کروانا چاہتا ہے لیکن وہ کسی طور مان کر نہیں دیتے۔ سخت مشکل میں ہے۔ اللہ والوں سے رجوع کرنے کا سوچتا ہے اور نام پلی، کا رخ کرتا ہے۔ حیدر آباد (دکن) کا وہ علاقہ، جہاں مرکزی ریلوے اسٹیشن تھا۔ نام پلی کی وجہ تسمیہ یہ تھی کہ عبداللہ قطب شاہ کے دیوان سلطنت رضا قلی نیک نام خاں کے نام پر آباد ہوا۔ عوام نے نیک نام خاں، سے نام چنا اور اس کے ساتھ تلگو کا لفظ پلی جوڑ کر نام پلی بنالیا۔ نامپلی میں ایک درگاہ تھی، جہاں جمعرات کے دن معمول سے زیادہ بھیڑ بھڑ کا رہتا۔ لوگ فاتحہ خوانی کو بھی آتے اور درگاہ کے سجادہ نشین سے دعا بھی کرواتے۔

وہ وہاں پہلی بار گیا تھا۔ درگاہ میں حاضری کے اطوار سے یکسر نابلد۔ بس ایک ہی جملے کا ورد کیے جا رہا تھا مجھے مکان واپس دلوا دیجئے۔

درگاہ سے ملحقہ مسجد کے صحن میں ''اللہ ہو'' کا ورد جاری تھا اور درگاہ کے سجادہ نشین کی وہاں موجودگی بھی ثابت تھی، لیکن مرادیں مانگنے والوں کا ایک اژدہام تھا۔ جب تک ان تک پہنچتا، حضرت نے قوالوں کی منڈلی کا رخ کرلیا۔ قوالوں کو نذرانہ پیش کیا جاتا رہا اور یہ سلسلہ رات گئے تک جاری رہا۔ یہ دیکھ کر وہ اٹھ آیا۔ اگلے روز وہ حضرت قبلہ کے گھر چلا گیا کہ عرض گزارے کسی نے اسے یہ بھی بتا دیا تھا کہ قابض کرایہ دار، حضرت قبلہ کے خاص مریدوں میں سے ہے۔ اب اس کی مشکل سوا تھی۔ سخت مضطرب، وہ دروازے میں جوتوں کے قریب بیٹھ گیا۔ دالان میں تل دھرنے کو جگہ نہ تھی اور حضرت بیان فرما رہے تھے ''علم دو ہیں..... ایک علم ظاہر...... دوسرا علم باطن.....'' وہ کرے تو کیا کرے حضرت قبلہ کا بیان طول پکڑ گیا۔ تاوقتیکہ نماز کا وقت ہو گیا اور وہ حضوری سے ایک بار پھر محروم رہا۔

ایک یونیورسٹی ٹیچر کی اس سے زیادہ کیا تذلیل ہو سکتی تھی اسے اس مقام تک پہنچا کر معمولی استعداد کا افسانہ نگار نا کام و نامراد شخص کو متعلقہ درگاہ اور حضرت قبلہ کے گرد قائم شدہ عقیدت کے حصار سے متنفر دکھا سکتا تھا پر یہ ایک فطری لیکن حد درجہ معمول کا ادنی سا ردعمل ہوتا۔ افسانے کی

بنیاد بننے والی ایک معمول کی بات معمول کے درجے سے اوپر نہ اٹھتی۔ قاری کو جھٹکا اس وقت لگتا ہے جب وہ اپنی دوسری ناکامی پران جعل سازوں، جنھوں نے اہل صوف کا مکھوٹا چڑھا رکھا ہے کی جانب قلبی جھکاؤ محسوس کرتا ہے۔ ایسا نہیں کہ وہ تصوف کی حقیقت سے نا آشنا ہے۔ یہودیت کے 'زہاد' عیسائیوں کی 'رہبانیت' مجوسیوں اور زرتشوں کی فکر اور ویدانت کے فلسفے پر اس کی گہری نظر ہے۔ یہ جھکاؤ درحقیقت اس کی غرض کی شدت ہے۔ اس کا خواب دیکھنا ثابت کرتا ہے اس نے مکان واگزار کروانے کے جھمیلے میں بہت پاپڑ بیلے۔ آخر بے بس ہوگیا۔ خواب میں بشارت ملنے کا سلسلہ موقوف ہوا وہ تھکا ہارا تیسری بار درگاہ کا رخ کرتا ہے اور صادق العقیدت مریدین کے آخری سرے پر جا بیٹھتا ہے۔

حضرت قبلہ کا بیان جاری تھا اور ذکر ہو رہا تھا میدان کرب وبلا میں امام حسینؑ کی بیعت کرنے والے صابرین کا اور اشارہ تھا حسینؑ کے یزید کے ہاتھ پر بیعت کرنے کی جانب۔ اس نے سوچا کہ دل نہ بھی مانے تو کیا مصلحت کے تحت بیعت کر لی جائے؟ اس کے ذہن میں ابھرنے والا یہ سوال ایک بڑی زقند ہے جو اسے کھائی کے اوپر فضا میں معلق کر دیتی ہے۔ نہ کھائی میں گرتا ہے، نہ اسے الانگھ پاتا ہے۔ یہاں سے یہ افسانہ Habituation کی نفسیات کی جانب نکل جاتا ہے۔ اس کے بعد نہ تو اس محفل میں مکان پر قابض کرایہ دار بیٹھا دکھائی دیا نہ حضرت قبلہ کی لن ترانیوں نے اسے موقع دیا کہ وہ اظہار مدعا کرے۔ وہ تو درگاہ تک جانے، وہاں بیٹھنے اور سننے کا عادی ہوتا چلا گیا۔

اس کی یہ قلب ماہیت، روحانی ہی نہیں جذباتی سطح پر بھی ہے۔ مدت بعد اس کا جی چاہا کہ گھر جائے اور اپنی منکوحہ کی گود میں سر رکھ کر جی ہلکا کر لے۔ اس کا راضی بہ رضا اور پرسکون ہو جانا، اس معمول کی بات (جس پر افسانے کی عمارت کھڑی ہے) میں کتنے ہی معنوی ابعاد پیدا کر دیتے ہیں۔ ایسے میں ایک ضمنی قصہ افسانے میں کیا سجا ہے، سبحان اللہ، بادشاہ دونوں بزرگوں کے

آگے سر جھکائے کھڑا ہے۔ انھوں نے اس سے ایک ٹھیکری منگوائی ...... پھر وہ بادشاہ کی طرف دیکھتے ہوا بولا" جاؤ، ان سے کہہ دو کہ وہ چلا گیا" وہ چمار نہیں اس زمانے کے قطب تھے جو ابوالحسن تانا شاہ کی سلطنت کی حفاظت کر رہے تھے۔ ان کے جانے کے بعد قلعہ فتح ہو گیا۔

وہ تو اپنی منکوحہ کی گود میں سر رکھ کر جی ہلکا کر لیتا لیکن گھر میں ایک بیوی ہی تو تھی، جسے مکان واگزار کروانے کی جلدی تھی۔ لمحہ بھر کے لیے اپنی بیوی کی جانب اس کے اٹھتے ہوئے قدم، دنیا داری کا آخری حیلہ تھا اور اس کا لیٹے لیٹے کروٹ بدل کر سو جانا، راضی بہ رضا ہو جانے کا اشارہ ہے۔

حضرت قبلہ کا اس کی جانب متوجہ ہونا، اسے اپنے قریب بلانا، سینے سے لگا کر بھینچنا اور پشت تھپتھپانا اپنے اندر خاصی تہہ داری سمیٹے ہوئے ہے۔ حقیقت میں ایسا ہوا یا نہیں؟ کچھ کہہ نہیں سکتے اس لیے کہ وہ تو Habituation کا شکار ہو کر دنیا و مافیہا سے بے پروا ہو گیا تھا۔ اس روز کرایہ دار، مکان خالی کر کے اس کے گھر چابی دے گیا تھا یا نہیں؟ کیا پتا۔ اس کا صدق دل سے یہ دعا مانگنا کہ اے اللہ، مجھے مسکین رکھ، کسی ایک قطعی اور حتمی نتیجہ کی بجائے افسانے کو کئی ایک معنوی ابعاد سے ہمکنار کر دیتا ہے۔

افسانہ" سانسوں کے درمیان" میں مرکزی کردار کی نفسی کیفیات کو 'شعور کی رو' کی تکنیک میں رقم کیا گیا ہے۔ افسانے کا مرکزی کردار مختلف نفسی کیفیات کے تحت تیزی سے محسوسات اور تخیلات کے ایک زون سے دوسرے زون میں حرکت کرتا رہتا ہے۔ اس حوالے سے اس کا لاشعور اس کا معاون و مددگار ہے۔ سگمنڈ فرائیڈ کے نظریہ لاشعور کی عطا، اس تکنیک کا تعلق موضوع سے زیادہ Method سے ہے، جس کے تحت دماغ میں آئے بے ربط امور نئی ترتیب میں ڈھلتے ہیں یوں اس افسانے کے مرکزی کردار کے ذہن میں بننے اور تحلیل ہو جانے والی حقیقت سے مشابہ تصویروں کا ربط ضبط کسی منطق یا استدلال کی وجہ سے نہیں بلکہ لحظہ بہ لحظہ لاشعور سے شعور میں داخل

ہونے والی کیفیات سے ہے۔اب تو Pribram اور Spinelli کے لیباٹری تجربات نے بھی یہ بات ثابت کردی ہے کہ دماغ کا حرکی نظام، انسان کے حسی نظام پر اثر انداز ہوتا ہے۔اس کا مطلب یہ ہوا کہ دماغ اپنی ''درآمد'' کا من پسند انتخاب کرتا ہے۔ضروری نہیں کہ وہ ''من پسند انتخاب''اس کے لیے سودمند بھی ہو۔وہ اس کے لیے گھاٹے کا سودا بھی ہوسکتا ہے۔۔

افسانہ ''سانسوں کے درمیان'' میں اس کی بہترین امثال وہ ہیں، جب افسانے کے مرکزی کردار کے والد کو ICU سے پیئنگ روم (Paying Room) میں منتقل کیا جاتا ہے۔ اس موقع پر اس کے محسوسات کے درجے نوٹ کریں تو یکے بعد دیگرے اچنبھے کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔

ا) اگر مریض پیئنگ روم میں آ گیا تو لواحقین کے جیب میں ادائیگی کرنے کو معقول رقم ہونا شرط ہے۔

2) مریض کی حالت کیا سنبھلی، افسانے کا مرکزی کردار ایک نئی الجھن کا شکار ہو گیا کہ میاں بیوی کے پاس نئے کپڑے، جوتے تو ہیں نہیں کریں گے کیا؟

اسی نوع کے پیچ، بیگ احساس کی افسانوی تدبیرکاری کا خاصہ ہیں۔اس دوسرے سوال کے سر اٹھاتے ہی افسانے کے بنیادی قضیے مہنگے ہسپتال کی فیس اور باپ کے مرجانے کا اندیشہ قدرے تحلیل ہو گئے۔اب افسانے کے مرکزی کردار کی دبی ہوئی خواہشات یکے بعد دیگرے اسے ایک ٹائم زون سے دوسرے ٹائم زون میں دھکیلتی ہیں۔ پیئنگ روم سے ملحقہ واش روم میں وہ اکیلا، نہاتے ہوئے کمرے میں موجود عورت کو آواز دے کر بلاتا ہے۔ جو اس کی بیوی ہے، لیکن ذہن کے دوسرے زون میں منتقل ہو جانے کے سبب وہ اپنے ساتھ نہاتی ہوئی منکوحہ عورت کے جسم میں وہ کساوٹ محسوس کرتا ہے، جو صرف اور صرف کسی کنوارے نسوانی وجود سے مخصوص ہے۔ پھر یہ کہ اس کسے ہوئے نسوانی وجود کا مزاحمت کرنا (جب کہ اس کی منکوحہ، اس کے بچوں کی ماں، کیا

مزاحمت کرے گی) قدرے الگ نوعیت کی مزاحمت ہے، جس کا تعلق سسر کے مکمل ہوش میں آجانے سے ہے۔ وہ اگر ہوش میں آ گئے تو کیا سوچیں گے؟ جب کہ اپنی ہی منکوحہ کے وجود میں ان چھوئی حسیناؤں کی تلاش اور بیوی کے بال اور آئی بروز بنوانے اور مینی کیور، پیڈی کیور کی خواہش نیز گھر کے لیے میکسی گرائنڈر، کولر اور اسفنج کے گدے کی خریداری اس تبدیل ہوتے ہوئے ذہن کے سبب ہے۔ والد کی بیماری اور آبزرویشن کے گنے چنے دنوں میں ہسپتال کے VIP ماحول میں رہنے کا لازمہ۔ لیکن ایسے میں جب والد ICU سے نکل کر پیینگ روم میں آ گیا اور تن درستی کی طرف بڑھ رہا ہے تو بچوں کے لیے ریڈی میڈ کپڑوں کی خریداری کیوں ضروری ہے؟ اس کے جواب میں صرف یہ نہیں کہا جا سکتا کہ وہی تبدیلی، جو VIP ماحول میں رہنے کا لازمہ تھا وہ بھی ہے، لیکن ایک سبب وہ اندیشہ بھی ہے جو اندر ہی اندر جڑ پکڑ رہا ہے کہ باپ مر گیا تو اپنوں اور غیروں کے جمع ہونے پر بچوں کی حالت بہتر دکھائی دے اور بھرم رہ جائے۔ اور بالآخر ہوا بھی وہی۔ جب محسوسات اور مشاہدات کے نتیجہ میں ذہنی اور جذباتی تبدیلی آ گئی تو اس تبدیلی کا واحد سبب (والد) زندگی کی بازی ہار گیا۔

افسانے کے اختتام پذیر ہو جانے پر اک ذرا تامل...... یہ تو ظاہر ہے کہ مرنے والا اپنے بیٹے، بہو اور پوتے پوتیوں کی زندگی میں جینے کی اک نئی امنگ بھر کر گور اُتر گیا۔ لیکن اس پر بھی تدبر کی ضرورت ہے کہ بیگ احساس نے کس طرح افسانے کو اس انجام تک پہنچانے سے پہلے درمیان میں معنویت کی تہیں بچھائیں اور کس طور بچھائیں۔

''رنگ کا سایہ'' تہہ دار بیانیہ میں تحریر کردہ محبت کی ایک شاہکار کہانی ہے۔ جس کی بنیاد حیدرآباد (دکن) سے مخصوص تہذیبی اور سماجی اقدار اور مسلم آبادی کا احساس تفاخر بنا۔ یہ احساس تفاخر، قلم کار کے پرکھوں سے بذریعہ اجتماعی لاشعور آگے منتقل ہوا اور اب افسانہ نگار کے ناسٹلجیا کی صورت افسانے میں ایک برے قضیے کی صورت ابھرا۔ ناسٹلجیا کی دوسری لہر خود افسانہ نگار کے ذاتی

تجربات سے متعلق ہے۔ یوں ان دونوں اقسام کے ناسٹلجیا نے اس بظاہر معمول سے متعلق روز و شب مشاہدے میں آنے والی اوائل جوانی کی ناکام محبت کی کہانی کو خاص بنادیا ہے۔

افسانے کا آغاز ان دو لائینوں سے ہوتا ہے۔

'ہم اسی جگہ جارہے تھے، جہاں سے ہمیں راتوں رات افراتفری کے عالم میں بھاگنا پڑا تھا۔امی کا تو صرف جسم ساتھ آیا تھا۔روح شاید وہیں بھٹک رہی تھی پھر جسم بھی اس قابل نہیں رہا کہ ان کے وجود کا بار اٹھا سکتا۔آج اس جسم کو اسی زمین کے سپرد کرنا تھا۔''

کوئی بھی افسانہ نگار اس طور بہت بڑا جوا کھیلتا ہے۔لیکن بیگ احساس کو تاش کے پتے پھینٹنے کا فن آتا ہے۔تاش کے کھیل میں 'فلاش' کھیلتے ہوئے اتنا اعتماد صرف اس کھلاڑی میں ہوگا، جسے باون پتے یاد ہوں اور نہ صرف یاد ہوں بلکہ ایک ایک پتہ اس کی انگلیوں کے تابع ہو کہ جب چاہا دوسرے تیسرے ہاتھ Show مانگ لینے والے کسی تھڑ دِلے مدمقابل کو غلاموں کی ٹریل تھما کر خود دیکوں کی ٹریل رکھ لی اور لگے بلائینڈ کھیلنے۔

افسانے کے راوی کے دو سوال ''کیا امی کی موت کا ذمہ دار میں ہوں؟'' اور جواب کو سمیٹے ہوئے اگلا سوال کہ'' گھر چھوڑ کر تو سب بھاگے تھے۔پھر اس کی ذمہ داری ہمارے عشق پر کیسے آگئی؟ افسانویت کا جال بچھانے کا کام کرتے ہیں۔اسی طرح ماضی بعید سے متعلق بہن کے گھر سے ایک بیوہ کے بچوں سمیت بیڑی کالونی میں اٹھ آنے کا ناسٹلجیا کئی رنگ بدلتا اور افسانویت کی لہر کو طاقت فراہم کرتا ہے۔ بیڑی کالونی سے متعلق یادوں کے بہاو کو توڑ توڑ کر بیان کرنے (تاکہ طوالت کا احساس اکتاہٹ نہ پیدا کردے) کے حوالے سے افسانہ نگار کی فنی مہارت کا پتا چلتا ہے۔

افسانے کے نوجوان مسلم مرکزی کردار (راوی) نے پہلی بار ایک کنویں کی مینڈھ پر ہندو لڑکی لکشمی کو دیکھا جس نے اسے تلگو زبان میں 'پگلا لڑکا' کا نام دیا تھا۔لکشمی اسکول میں پڑھتی تھی اور اس کی ماں گھر میں پرانے رنگ برنگے کپڑوں کو جوڑ کر بنتہ سیتی رہتی تھی۔سندھی میں ہمارے ہاں

'بنتہ' 'کوُرلی' کہا جاتا ہے۔ دوسری طرف سب کچھ لٹ جانے کے باوجود مسلمانوں میں ایک طنطنہ تھا۔ ہندو جاتی کے مقابل ایک ایسا احساس تفاخر، جو اس افسانے میں جنم لینے والے المیے کا بنیادی سبب بنا۔ لکشمی، لکشمی کے بہنوائی (ملیا) اور لکشمی کی ماتا (ناگماں) کی عاجزی اور سیس نوائی، افسانے میں میٹھا درد بھرنے کا کام کرتی ہے۔ جب کہ افسانہ نگار کی جانب سے تہذیبی منطقے سے متعلق اٹھائے گئے سوالات کہ ''ہماری جڑیں کہاں ہیں؟ اس دھرتی سے ہمارا کیا رشتہ تھا؟ وہ جو اس دھرتی کی پہچان تھی؟ کیا ہوئی؟ اس میٹھے درد میں کڑواہٹ اور زہرنا کی بھر دیتے ہیں۔

ماں کے ساتھ کام میں ہاتھ بٹانے والی لکشمی کو کھیتوں کی طرف آنے میں تاخیر ہوئی تو اس کے ہونٹوں سے نکلا ''شما کردو'' یہ اس خاندان کا وہی مودبانہ رویہ ہے، جو لکشمی کی ماں، بالماں کے ساتھ فیکٹری میں بیڑیاں بنانے والی کو نام لے کر نہیں، درسانی (بیگم صاحبہ) کے عزت دارانہ طریق سے مخاطب کرواتا ہے۔ جب کہ لکشمی کے راجکمار کو یہ اعتراض کہ لکشمی کا بہنوائی رکشہ کیوں چلاتا ہے، کوئی عزت دارانہ کام کیوں نہیں کرتا اور اس کے جواب میں لکشمی انتہائی عاجزی سے وضاحت کرتی ہے کہ ہم ہمیشہ سے ایسے نہ تھے۔ اس کا یہ بیان حیدرآبادی انگ میں ملاحظہ کیجیے۔

> ''کیا کریں گے ان کو کوئی اور کام آتچ نئیں۔ اماں اور بھابھی سمجھا سمجھا کے تھک گئے۔ نائنا (والد) ہمارے گاوں کے نواب صاحب کے خاص آدمی تھے۔ اماں بولتے کہ نواب صاحب ان پہ بہوت بھروسہ کرتے تھے۔ ان کو ہر جگہ اپنے ساتھ رکھتے تھے۔ پولیس ایکشن میں ہمارا گاوں بہوت متاثر ہوا۔ نواب صاحب کا بنگلہ جلا دیا گیا۔ ان کے اپنے گاوں والے ان پر حملہ کرے تو نواب صاحب کو بہوت صدمہ ہوا۔ بعد میں جاگیراں بی ختم ہو گئے۔ پولیس ایکشن کے بعد نواب

صاحب گھر سے باہر نہیں نکلے ان کا جنازہ اپچ نکلا۔ نانا بی
زیادہ دن زندہ نہیں رہے۔ نانا کے انتقال کے وخت بہوت
چھوٹی تھی۔ہم لوگاں گھر بیچ کے یہاں آگئے۔ یہاں آنے کے
بعد انا رکشہ چلانے لگے''۔کچھ دیر خاموشی رہی۔''آپ لوگوں
کو دیکھ کے اماں نواب صاب کے گھر والوں کو بہوت یاد
کرتے۔''

اگر یہ تفصیل حیدرآبادی انگ میں نہ ہوتی تو کیا اس قدر سجتی؟ پھر لکشمی کی یہ سوچ کہ ''آپ لوگاں یہاں کیوں آئے، بیڑی بنانے والوں کی کالونی میں؟ ظاہر کرتی ہے کہ وہ راجکمار کی داسی ہے۔ راجکمار کی سندرتا اور گورا رنگ، برباد کر گیا لکشمی کو۔ اس نے دل و دماغ میں بٹھا لی راجکمار کی شبیہہ اور جب بچہ جنا تو وہ ویسا ہی تھا۔ وہی ناک نقشہ وہی رنگ جسے نہ برادری نے قبول کیا نہ اس کے شوہر نے جب کہ ان دونوں کا اس نوع کا جسمانی تعلق تو قائم ہی نہیں ہوا تھا۔ راجکمار کے بیڑی کالونی چھوڑ کر جانے کے سال بھر بعد شادی ہوئی تھی لکشمی کی۔ پر راجکمار کے رنگ کا سایہ ایسا پڑا کہ خاک کر گیا لکشمی کو ایک تہمت کی اتنی مار!

کچلے اور روندے ہوئے، ایک چنگھاڑ اس وقت بنتے ہیں، جب ان کی عزت پر ہاتھ ڈالا جائے۔ اور وہی ہوا۔ راجکمار کو اپنے گھر والوں سمیت، رات کی تاریکی میں نکلنا پڑا اس کالونی سے۔ رسی جل گئی پر بل نہ گیا۔ ایسے میں گھر چھوڑتے ہوئے اس مسلم گھرانے کا غُرّا دیکھیں کہ لکشمی کو 'حرافہ' کہا جا رہا ہے۔ کہا جا رہا ہے کہ ان لڑکیوں کا کام ہی یہی ہے کہ اچھے خاندانوں کے لڑکے گھیریں۔ لیکن جب انھوں نے رات کی تاریکی میں کالونی چھوڑی تو انھیں بس اسٹاپ تک رکشے میں لے جانے کے لیے صرف ایک رکشہ ڈرائیور، جو لکشمی کا بہنوائی تھا، تیار پایا گیا۔ پر یہ سب اس کے رکشے میں بس اسٹاپ تک کیوں جاتے، وہ تو اس حرافہ کا بہنوائی تھا۔

وقت گزر گیا اور جب ماں کی اپنے آبائی علاقے میں تدفین کی خاطر لکشمی کے راجکمار کا ادھر آنا ہوا۔ تو وہ لکشمی کے بہنوائی ہی کے رکشے میں بیٹھ کر قبرستان سے وہاں تک آیا۔

''کافی رونق ہوگئی ادھر تو''

''ہاں، آبادی بڑھ گئی ہے''

''پانی کا کنکشن لگ گیا؟''

''ہاں''

''کتنی تکلیف ہوتی تھی کنوئیں سے پانی بھرنے کے لیے''

وہ جواب میں کیا کہتا۔ چپ رہا۔ اس کا زخم ہرا ہو گیا تھا پانی کے کنویں پر ہی تو ملاقات ہوئی تھی لکشمی سے اس کی اور اس کے نتیجہ میں ملنے والی بدنامی اس کی سالی کا مقدر بن گئی۔

افسانے کے اختتام پر کوئی واضح جواب، کوئی واضح لائحہ عمل لٹی پٹی لکشمی کے راجکمار کے پاس نہیں، جو تہذیبی منطقے کی بات کرتا تھا ..... زمین سے اپنا ناتہ کھوجتا تھا۔ اس کے سامنے اس کی شکل شباہت کا گورا چٹا ایک ننھا لڑکا کھڑا ہے، جسے بیڑی کالونی کے سبھی لوگ اسی کی ناجائز اولاد تصور کرتے ہیں۔

وہ فولڈنگ چیئر پر بیٹھا، اپنے سامنے اجڑی ہوئی فرش نشین لکشمی سے متعلق اس دُبدا میں پڑ گیا کہ کسی جھمیلے میں پڑے بغیر محض لکشمی کو دلاسہ دے کر وہاں سے چپ چاپ اٹھ آئے یا اس بچے کے سر پر ہاتھ رکھے اور لکشمی کو اپنے ساتھ لیے کہیں دور چلا جائے۔ قوی امکان یہی ہے کہ 'رنگ کا سایہ' کھا جائے گا لکشمی کی جوانی........ کچھ نہیں بچے گا۔

بیگ احساس کے تخلیق کردہ کردار مختلف زمانوں میں چہل قدمی کرتے دکھائی دیتے ہیں۔ وہ زمانہ حال کو ماضی سے اور ماضی سے مستقبل کو اتنی سہولت سے جوڑ دیتے ہیں کہ بے اختیار داد دینے کو جی چاہتا ہے۔ افسانہ 'کھائی' میں مرحوم باپ کی میت برف کی سلوں کے حصار میں رکھی

ہے،اس لیے کہ پوتے نے اس وقت تک تدفین سے روک دیا ہے، جب تک وہ اپنے وطن واپس نہ آجائے۔ایسے میں شعور کی رو چپکے چپکے محض حال کو ماضی سے ہی نہیں جوڑ دیتی بلکہ گئی محافل کی گرد جھاڑ کر انھیں اجال بھی دیتی ہے۔کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ نفسیاتی الجھاوؤں کے سرے ماضی میں جھانکنے سے مل جاتے ہیں۔جیسے اس افسانے میں باپ سے بیٹے کے متنفر ہو جانے کا سبب معلوم ہوا۔نیز یہ بھی پتا چلا کہ یہ تین نسلوں کا الجھیڑا ہے،جس میں باپ کے ایک پرانے خدمت گار کی وفاداری جاگیردارانہ سوچ پر ضرب کاری ہے۔جاگیردارانہ سوچ کے حامل باپ کی شاہ خرچیاں گھر کا بجٹ خراب کرنے کا سبب بنتی رہیں اور بیٹے کی میانہ روی کو اہلکارانہ ذہنیت قرار دیا جاتا رہا۔یہی ٹکراؤ اندر ہی اندر افسانے کی بنت کرتا ہے۔مرحوم کے بیٹے (کفایت علی) کے لیے سب سے بڑا دھچکہ یہ ہے کہ نہ چاہتے ہوئے بھی جاگیردارانہ سوچ کی کونپل اس کے بیٹے کی صورت پھوٹی ہے۔جس کے نزدیک روپیہ، ہر شخص کے مقام اور مرتبے کا تعین کرتا ہے اور رشتے ناتے، سٹیٹس کے مطابق جڑتے ہیں۔حسب نسب، اعلیٰ اقدار اور ایمانداری کا زمانہ لد گیا۔عائلی زندگی سے متعلق کتاب میں شامل دو افسانے ''سنگ گراں'' اور ''نجات'' بظاہر سادہ بیانیہ میں لکھے گئے افسانے ہیں لیکن ان میں بھی خاص طرح کی تہہ داری ہے ''سنگ گراں'' تو آخر میں جا کر استعارے میں ڈھل گیا۔

افسانہ ''سنگ گراں'' کی تعمیر نسوانی احساسات ومحسوسات پر کی گئی ہے۔افسانے کے کچھ مقامات تو خالصتاً نسوانی بیالوجی سے متعلق ہیں، جسے رقم کرنے سے ہماری جری اور بے باک خواتین افسانہ نگاروں نے بھی پہلو تہی کی جیسے افسانہ ''سودا'' از رشید جہاں (مشمولہ ''عورت اور دوسرے افسانے'' مطبوعہ ہاشمی بک ڈپو، لاہور طبع اول ،نومبر ۱۹۳۷ء) میں بہت گنجائش تھی جنسی تحریص کے حوالے سے لکھنے کی لیکن رشید جہاں نے اندھیارے میں ہونے والے عمل پر چھچھلتی سی نگاہ ڈالی اور آگے بڑھ گئیں۔یہ سارا کچھ بیگ احساس کی صورت ایک مرد افسانہ

نگار کیوں کر لکھ پایا؟ تفصیل میں جانے سے خوف فساد خلق لاحق ہے۔ اس لیے اسے مقدر چھوڑتا ہوں۔

اس افسانے کا ایک ماضی ہے اور ایک حال۔ ماضی میں مذہبی کٹر پن براہِ راست نسوانی فطرت سے الجھ رہا ہے۔ ''ناخن رنگنے سے وضو نہیں ہوتا'' (مذہب اسلام کے تمام مسالک ماضی قریب کے اس اجتہاد پر متفق ہیں) یہ نانی کا بیان ہے۔ جب کہ فطرت نسوانی ناخن پالش کی طلب گار رہی۔ پھر عہد نو کے الگ بکھیڑے ہیں۔ ٹوٹ گیا، جوائنٹ فیملی سسٹم، روایات کا شیرازہ بکھر گیا۔ روایتی مذہبی گھرانے کی لڑکی گھر والوں کی مرضی کیا، ان کے علم میں لائے بغیر کورٹ میرج تو کرسکتی ہے لیکن آگے؟ لڑکا، لڑکی دونوں جاب کریں، تب بھی حالات ایسے نہیں بن پاتے کہ ایک چھت تلے اکٹھے رہ سکیں۔ بے شک کرائے کا مکان ہی کیوں نا ہو۔ بچہ نہیں لے سکتے، زچہ کی دیکھ بھال، ملازمت کو جاری رکھنا مشکل۔ Child farm میں رکھیں گے بچے کو؟ کیسے ہوگا سب؟ نو بیاہتے جوڑے میں یہ بحث کچھ دن چلتی ہے انجام کار ابارشن ہی ایک حل نکلتا ہے۔ ممتا بہت ہاتھ پاوں مارتی ہے پر کنارا نہیں ملتا۔ ڈوبنا جیسے طے ہے۔

اس سادہ بیانیہ افسانے میں معنوی ابعاد اس وقت چھلکنے لگتے ہیں، جب MTP کے ذریعے بچہ اندھے کنویں میں دھکیل دیا جاتا ہے۔ ایسے میں ممتا کھلی آنکھوں سے خواب دیکھتی ہے۔

''شاید وہ محفوظ ہے۔ کوئی قافلہ ادھر سے گزرے گا تو اسے باہر نکالے گا۔ اس کی وجاہت نازک انگلیوں کو زخمی کرے گی..... یوں وہ بچہ ماضی بعید کے یوسفؑ کے استعارے میں ڈھل گیا۔ جس کی وجاہت کے سبب زلیخا ہی نہیں، اس کی سہیلیوں نے بھی بھرے دربار میں سیب کاٹتے ہوئے اپنی انگلیاں کاٹ لی تھیں۔ بے شک، اسے مجرم قرار دے کر کال کوٹھری میں دھکیل دیا گیا، لیکن ایک دن آئے گا جب وہ اس کال کوٹھری سے خوابوں کا شارح بن کر نکلے گا اور ماں کی رو رو کر بہہ جانے والی آنکھوں کی بینائی بحال کردے گا۔''

یہ افسانہ تو تھا عہد جدید میں عائلی زندگی پر پڑنے والی افتاد سے متعلق، جب کہ دوسرا افسانہ ''نجات'' اس عارضے سے متعلق ہے جس نے ''نائن الیون'' کے بعد پر پرزے نکالے۔ مذہبی کٹّر پن بڑھا اور مسلم ورلڈ ایک دوراہے پر آ کھڑی ہوئی۔

ایک مغربی ملک کی آزادخیال سوسائٹی (جو کسی طور انڈر ورلڈ کے زیرنگیں علاقہ نہ تھا) میں ایک ذہنی طور پر تبدیل شدہ اجنبی (فرحان) نہ کھپ سکا لہٰذا اس کا وہاں رہنا اور روزی کمانا ناممکن ہو گیا۔ کیوں اور کیسے؟ اس سوال کو افسانہ میں اٹھا کر قاری کو اس کا جواب کھوجنے پر لگا دیا گیا ہے۔ کسی بات کو سمجھانے کا اس سے بہتر طریقہ کوئی نہیں۔

مذہبی جنونیت کے شکار، فرحان کی بیوی عاشی کا ہر نوع کی تہمت برداشت کرنا، اس ہندوستانی پتی ورتا بیوی کا ایک روپ ہے، جو ہر قیمت پر اپنا سہاگ بچانے کی فکر میں ہوتی ہے۔ لیکن عاشی کا کوئی جتن، مذہبی جنونیت کے مقابل بارآور نہ ہو سکا۔ جب طوفان تھم گیا تو عاشی نے یہ کہہ کر کہ ''میں تو ویسی ہی رہ گئی۔ پہلے نفرت اور دیوانگی کی وجہ سے دور رہتے تھے، اب شرمندگی اور احسان مندی کی وجہ سے دور رہتے ہیں۔ میں انھیں اس عذاب سے نجات دلانا چاہتی ہوں۔'' خود کو فرحان سے الگ کر لیا۔ یہ ایک ایسا ردِّعمل ہے، جو زمانہ حال میں ہمارے ہاں اٹھنے والے کٹر پن کے طوفان کے آگے بند باندھنے کے مترادف ہے۔

افسانہ ''چکرویو'' کا منظر نامہ Time-frame کے اعتبار سے تین پہروں میں بٹا ہوا ہے، جس میں دھرت راشٹر اور سنجے کے مکالمے کی صورت ہر یگ سے قدیمی اتہاس کے مختلف بند رقم کر دیئے گئے ہیں۔ ہر یگ کے انت پر آنکھیں دیکھی اور کانوں سنی سے ایک ہی نتیجہ برآمد ہوا کہ اس یگ کی شناخت ہٹ دھرمی، بے حیائی اور بے ضمیری ہے۔ پھر ہر یگ کے انت پر آپ ہی آپ اس جلی ہوئی مٹی سے ایک نئی زندگی جنم لیتی ہے اور نوزائدہ بچے کی مسکان، گہرا طنز بن جاتی ہے، انیائے کرنے والوں کی سوچ پر۔

بیگ احساس نے ویدوں سے مخصوص ملفوظاتی طریق میں کئی یگوں پر محیط انسانی حیات رقم کر دی ہے، لیکن Captions کے بغیر۔ اس میں ماضی بعید کی بربریت بھی موجود ہے، ماضی قریب کا جلتا ہوا احمد آباد بھی اور عہد حاضر کا میرانشاہ، میر علی اور دتہ خیل کا پاکستان سے متعلق علاقہ غیر بھی۔

افسانہ ''درد کے خیمے'' آزادی ۱۹۴۷ء کے بعد حیدرآباد (دکن) سے کراچی (پاکستان) براستہ کھوکھراپار، ہجرت سے متعلق ایک یک سطحی بیانیہ افسانہ ہی رہ جاتا، اگر اس میں بہن، بہنوائی اور ننھی بھانجی کی ہجرت کے تجربے میں پیچھے رہ جانے والوں کے ملال کو شامل نہ کر دیا جاتا۔ بیگ احساس نے اس افسانے میں ناسٹلجیا کی ایک نئی جہت یوں شامل کر دی کہ ہم ہجرت کریں یا ہمارا کوئی عزیز، گزرتے ایک ہی تجربے سے ہیں۔ پھر یہ کہ جیسا اوپر بیان ہوا، بیگ احساس کے افسانوں میں دھرتی سے جڑت اور تہذیبی اقدار کی شکست کا بیان اپنی جڑوں کی تلاش کا عمل بن جاتا ہے۔

اس افسانے کے مرکزی کردار کو اس مختصر سے مہاجر گھرانے کی طرف جھانکنے کا وقت تیس برس بعد میسر آیا، جب بہن نہ رہی۔ انسولین کے عادی بہنوائی اور بھانجی نے اسے ایئرپورٹ سے لیا۔ ایسے میں اس ہمیشہ کے لیے بچھڑ جانے والی بہن کا آنسوؤں سے تر چہرہ، جو کبھی ہجرت کرتے وقت ٹرین کے ڈبے کے ساتھ آگے بڑھ گیا تھا، اس کی آنکھوں میں ٹھہر گیا۔

عمر رسیدہ بہنوای اور اس کے بچوں کی سوچ کا فرق اس کے لیے حیران کن تھا۔ بچے پاکستان کے فرد ہونے پر اتراتے ہیں اور بہنوائی، اتنا وقت گزر جانے کے باوجود گمشدہ حیدرآباد میں ہی میں جی رہا ہے۔ صد افسوس! کہ تقسیم پر اتنا وقت گزر جانے کے باوجود ویزا کا حصول مشکل۔

اس کے بہنوائی نے فون پر بتایا کہ اسے ایرپورٹ چھوڑ کر وہ دوبارہ قبرستان گئے تھے لیکن بہن کی قبر غائب ہے۔ تلاش کے باوجود کہیں نہیں ملی۔ تو کیا اپنے وطن جانے کی حسرت لیے مر

جانے والی اس کی بہن کی مٹی اس کے ساتھ آ گئی؟

افسانہ ''شکستہ پر'' میں سمیر اور سشما جب پہلی بار ملے تھے تو ننھی سمن نے ششما کی انگلی تھام رکھی تھی اور سمیر نہیں جانتا تھا کہ سشما، طلاق یافتہ اور ایک بیٹی کی ماں ہوگی۔ پھر دس برس بعد ملے تو بہت کچھ کھو چکنے کے احساس کے ساتھ دونوں نے شادی کر لی۔ یوں ان کی محبت کا آغاز شادی کے بعد ہوا۔ سمن، اپنی ماں کے ساتھ جانے سے انکاری تھی، وہ اپنے نانا، نانی کے گھر ہی رہی۔

ابتدا میں بیٹی سے سشما کے کٹ جانے کا دکھ بظاہر دکھائی نہیں دیتا، دھیرے دھیرے سر اٹھاتا ہے۔ جب کہ سمن کے گھر آ جانے تک سمیر اس حقیقت سے لاعلم ہے پھر جیسا کہ فطری طور پر ہونا بھی چاہیے، سشما کی یہ آرزو تھی کہ سمیر، سمن کو بیٹی کے طور پر قبول کر لے لیکن اس کے بعد ماں، بیٹی ٹکرا گئیں۔ کبھی سمیر کی محبت سمیٹنے کے معاملے میں اور کبھی سمن کے حد درجہ بولڈ ہونے کے حوالے سے سمن کا اپنے نانا نانی کی جانب جھکاؤ بھی سشما کے لیے ناگوار خاطر رہا۔

سشما کا یہ رویہ بظاہر ابنارمل نفسیات سے مشابہ ہے، لیکن اس کا بھی ایک سبب ہے کہ سشما کی ماں نے اسے کم عمری میں بیاہ کر اس کا گھر بسنے نہیں دیا۔ جب شادی کی عمر کو پہنچی تو اسے سمیر بھا گیا لیکن اس کا طلاق یافتہ اور ایک بیٹی کی ماں ہونا دس برس کھا گیا۔ اب بیٹی کی اٹھتی جوانی اس کے مدمقابل تھی۔

بیگ احساس، اس نوع کی گتھیاں اپنے افسانوں میں سہج سہج کھولتے ہیں۔ معلوم ہوا کہ گئے دنوں میں ششما، سمن ہی کی عمر میں ناسمجھی کی بنا پر اپنے شوہر کی بھابھی سے شکست کھا کر طلاق تک پہنچی تھی۔ شکست پر شکست وہ تلملا کر رہ گئی۔

اس نوع کے نفسی الجھاوؤں کو ضبط تحریر میں لاتے ہوئے، بیگ احساس، تہہ در تہہ اظہاریئے سے کام لیتے اور سوالات کے لامتناہی سلسلوں کو سہ رستوں اور چورستوں تک لے آتے

ہیں۔ افسانہ نگار یہ کیوں بتائے کہ سمن کا گھر سے ناراض ہو کر نکل جانا کس کے حق میں بہتر رہا۔ پھر یہ سوال الگ کہ سمن اپنے نانا، نانی کی تنہائی میں کمی کا باعث بن کر ایک بار پھر سشما کو شکست سے دو چار تو نہیں کر گئی؟ اس کا جواب بھی کچھ اتنا سہل نہیں یہ سشما کے لیے باعث کرب بھی ہے اور باعث اطمینان بھی۔ اس کی آنکھوں سے آنسو بھی رواں تھے اور چہرے پر اطمینان بھی تھا۔ پرندے ایک ایک کر کے پھر سے جاگ گئے تھے اور جال سمیت اونچائی میں پرواز کرنے لگے تھے۔ بیگ احساس کا وہی من پسند طریق کار، جو سادہ بیانیے کو بھی معنوی سطح پر اٹھا کر کہیں سے کہیں پہنچا دیتا ہے۔

اب آیئے زبان و بیان کی طرف اس کے باوجود کہ بیشتر افسانوں میں تاریخ، سیاست، مذہب، معیشت اور معاشرت زیر بحث رہے پھر بھی خالصتاً علمی موضوعات سے مخصوص سپاٹ دو ٹوک زبان کہیں دیکھنے کو ملتی جو Information بہم پہنچانے کا لازمہ ہے۔ بیگ احساس نے کہیں کہیں بولی ٹھولی کی سطح پر حیدرآبادی انگ بھی برتا ہے اور سنسکرت اور ہندی بھی لیکن صرف مکالموں کی سطح پر۔ راوی کے بیانیہ میں نہیں۔ زبان و بیان سے متعلق یہ وہ شعور ہے، جس سے ہندوستان اور پاکستان میں لکھا جانے والا بیشتر حالیہ افسانہ خالی دکھائی دیتا ہے۔ نسبتاً پاکستان میں بلوچی، سرائیکی، پنجابی، پشتو اور ہندوستان میں بڑے شہروں کی Slang اور ہندی کے الفاظ کی پیوند کاری جاری ہے۔ جب اس خامی کی نشاندہی کرو تو جواب میں یہ سننا پڑتا ہے کہ وقت کے ساتھ ساتھ وسعت الفاظ کون لائے گا؟ حال آنکہ افسانہ نگار کی زنبیل ان مقامی زبانوں کے الفاظ کی متبادل اردو لفظیات سے خالی ہوتی ہے۔ ''نور اللغات'' فرہنگ آصفیہ اور ''جامع اللغات'' کے انھوں نے نام تک نہیں سنے، کھول کر کیا دیکھیں گے۔

ایک مدت بعد مجھے ان افسانوں میں اتنی نتھری ستھری زبان پڑھنے کو ملی، جو نہ تو اردو کا لکھنوی رنگ ہے، نہ دہلوی لیکن کیا کہنے صاحب! اب وہ زمانہ لد گیا، جب راشد الخیری، اشرف

صبوحی، صادق الخیری اور آمنہ نازلی نے اپنے افسانوں میں اردوئے معلّی کی خوشبو بسالی تھی۔ اب تو دلی میں بھی کرخنداری کا چلن ہے۔

انتظار حسین کی زبان و بیان پر صدقے واری جانے والے کبھی یہ نہیں کہیں گے کہ انتظار حسین کی زبان و بیان کا تعلق دور دور تک دہلوی رنگ سے نہیں، میرٹھ اور بلند شہر کے دیہی علاقہ جات سے ہے۔ جس میں تذکیر و تانیث کی قطعیت پنجاب کی دین ہے۔ دہلی اور لکھنو کے مراکز سے دور بیٹھے بیگ احساس کا اس ضمن میں کوئی دعویٰ نہیں۔ وہ تو اسے محض گنگا جمنی تہذیب کی عطا شمار کرتے ہیں۔

ان افسانوں میں بیگ احساس کی حال مست اور پُر باش زندگی کی جھلکیاں بھی ہیں اور ان کی رسمی اعتقادات سے دوری بھی۔ اس کا ایک سبب ہے۔ ان کے اجداد اورنگ زیب عالمگیر کی افواج کے ساتھ دکن میں وارد ہوئے تھے۔ مغول ہوتے ہی ایسے ہیں۔ جب عمر شیخ مرزا کے بیٹے ظہیر الدین بابر نے فرغانہ سے نکل کر ہندوستان کا رخ کیا اس کے بازو بن کر ساتھ چلنے والے بھی مغول ہی تھے، جنھوں نے اپنے چغتہ سردار بابر کے ایک اشارے پر درہ خیبر اور اٹک بنارس کے ''کالا چٹا'' پہاڑی سلسلے میں قدم جما کر شب خون مارنے والے پٹھانوں کے سروں کے مینار بنائے اور عالمگیر لشکر کا پھریرا دکن پر لہرا کر وہیں بس گئے۔

بیگ احساس کی حیدرآباد (دکن) کی سرزمین اور اس کی قدیمی روایات سے جڑت در حقیقت اپنے اجداد کے قدیمی مسکن سے جڑت کا ثبوت ہے۔ قبرستانوں میں گڑی بوسیدہ ہڈیاں جوڑے رکھتی ہیں ماضی بعید کو لمحہ موجود سے۔

☆☆☆

لاہور، پاکستان　　　　　　**مرزا حامد بیگ**

سنگِ گراں

ڈریسنگ ٹیبل پر رکھی ہوئی نیل پاش نے اسے چونکا دیا۔اس نے کیلنڈر پر نظر ڈالی مہینہ ختم ہورہا تھا لیکن اس نے ناخن رنگے ہی نہیں تھے۔

تو کیا؟

''ناخن پر پالش لگانے سے وضونہیں ہوتا''۔اس کی نانی نے اس سے کہا تھا اور اسی وقت ناخنوں سے پالش کھرچ دی تھی۔نانی نماز کی پابند تھیں اسے بھی کوئی نماز قضا کرنے نہیں دیتیں تھیں۔پھر بھی وہ موقع نکال کر رات میں ناخن رنگ لیتی پھر فجر سے قبل ناخن صاف کر دیتی۔اس طرح اس کے ناخن خراب ہوسکتے تھے لیکن شوق!

ایک روز جب اس کا جسم اچانک ہی خون اُگلنے لگا تو وہ مارے خوف کے نانی کی گود میں گھس گئی۔نانی نے بہت سی باتیں سمجھائیں پھر کہا کہ ایسی حالت میں وہ نماز نہ پڑھا کرے۔تب اس نے ناخن رنگ لیے۔نانی نے ڈانٹا نہیں مسکراتی رہیں۔

ایک طرف ناخن رنگنے کی خوشی تھی تو دوسری طرف مصیبت بھی۔ نماز نہ پڑھنے پر بھی ایسا محسوس ہوتا تھا جیسے کچھ بھول رہی ہو ہر اذان پر چونک کر اُٹھتی پھر ناخن دیکھ کر مسکرا دیتی۔ ان دنوں کہیں جانے کو جی نہیں چاہتا تھا۔ عجیب سے بساندھ بھرے دن، چپچپاہٹ کا احساس، مضمحل اعضاء، وہ سارا دن نانی کی گود میں گھسی رہتی نہ دعوتیں نہ کسی سہیلی کے گھر جانا۔ اکثر اسکول کا بھی ناغہ کر دیتی۔ اپنے پالش سے رنگے ناخن گھورا کرتی۔ اس کے ناخن تھے بھی بہت خوب صورت۔ دیکھتے ہی دیکھتے کتنا کچھ بدل گیا ہے۔ اب ٹی وی کے اسکرین پر حسینۂ عالم اُچھلتی کودتی آتی ہے اور بڑی بے حیائی سے بھری بزم میں راز کی بات کہہ دیتی ہے۔ کسی کو بُرا نہیں لگتا بچے بڑے سب آرام سے بیٹھے رہتے ہیں۔

اب تو نانی بھی نہیں رہیں۔ ان دنوں کا خوف بھی پہلے جیسا نہیں رہا۔ لیکن وہ ناخن ضرور رنگتی تھی۔ یہ ناخن اسے یاد دلاتے تھے کہ نماز کی چھٹی ہے۔

''تو کیا۔؟''

مسرت کی ایک لہر پورے وجود کو گدگدا گئی۔ اگر ایسا ہے تو کتنا عجیب اتفاق ہے۔ شادی کے بعد صرف ایک ہی رات دونوں ملے تھے۔ اس کی سہاگ کی نشانی ہے یہ تو۔ اگر وہ جنم لے تو پھر وہ شادی کی اور اس کی سالگرہ ایک ساتھ منائے گی۔ اس کے جنم دن کے روز وہ سالگرہ نہیں منائے گی کیونکہ وہ جانتی ہے کہ کب وہ اس کے وجود کا حصہ بنا۔ ایسا موقع کسے ملتا ہے۔ یہ سراغ ملتا ہی نہیں۔ کوئی نہیں جانتا کہ کون سا بچہ کس ساعت کے عمل کا نتیجہ ہے۔ لیکن وہ بتا سکتی ہے۔ وہ مسکرا دی۔ اس نے ہولے ہولے اپنے پیٹ پر ہاتھ پھیرا۔ خواہ مخواہ ہی اسے اپنا پیٹ اُبھرا اُبھرا سا نظر آیا۔

''ابھی سے۔؟'' وہ کھلکھلا کے ہنس دی۔

اس کی انگلیاں ناف تک پہنچیں تو ہلکا سا ارتعاش محسوس ہوا۔ باریک سی آواز آئی۔ ممی۔!!

وہ چونکی۔ہاں یہ آواز اس کی ناف سے ہی آئی تھی۔اس کا جی چاہا کہ اپنی ناف کو کان لگا کر اس آواز کو قریب سے سنے۔لیکن یہ کیسے ممکن تھا۔دوسرا سن سکتا ہے۔دوسرا؟

شام میں جب وہ ملے گا تو اسے سنائے گی آواز۔!!

گھر سے نکلی تو بہت سنبھل سنبھل کے قدم رکھے۔سارا دن کام میں دل نہیں لگا۔وہ لوگوں کو ٹالتی رہی۔دن بھر میں کئی بار اس نے وہ باریک سی آواز سنی۔

ممی۔ممی۔!!

''چپ'' اس نے پیار سے ڈانٹا۔اپنے ساتھیوں کے ساتھ اس نے لنچ بھی نہیں کیا کہ کہیں کوئی وہ آواز نہ سن لے۔سب سے پہلے وہ آواز اُسے ہی سنانا چاہتی تھی۔

شام ٹھیک وقت پر وہ اسے لینے آیا۔وہی روٹین لائف،دفتر سے پارک جانا چراغ جلنے تک بیٹھے رہنا۔سڑکوں پر گھومنا ......کسی ریستوران میں کھانا۔کسی تھیٹر میں کوئی فلم ......کوئی بھی فلم۔ انگریزی،ہندی،تلگو۔ساتھ وقت کاٹنا مقصد تھا۔اس صورتحال سے دونوں اُوب گئے تھے۔میاں بیوی ہو کر بھی عاشقوں کی طرح وقت گزارنا۔مشکوک نظروں کی غلاظت سے گزرنا......کتنا تکلیف دہ ہو گیا تھا سب کچھ......

دونوں نے شادی تو کر لی تھی لیکن ان کا اپنا کوئی گھر نہیں تھا رات وہ اسے چھوڑ کر لوٹ جاتا آج اس کا کتنا جی چاہا کہ اس کا اپنا گھر ہوتا وہ سیدھے اپنے گھر جاتے پھر وہ اپنی ساڑی ہٹا کر اپنا پیٹ ننگا کر دیتی اور اس سے کہتی کہ اپنا کان اس کی ناف سے لگا کر وہ باریک سی آواز سنے ......ممّی ......!!

اسکوٹر کی پچھلی سیٹ پر وہ بہت احتیاط سے بیٹھی۔سنبھل کر۔پتہ نہیں کیوں آج اسے ایسا محسوس ہو رہا تھا جیسے وہ ریش ......ڈرائیونگ کر رہا ہو پھر شہر کی سڑکیں بھی کتنی ناہموار لگ رہی تھیں ویسے وہ گاڑی تیز نہیں چلاتا تھا۔دنیا بھر کی باتیں اسکوٹر پر ہی ہوتیں اس نے رفتار دھیمی کر دی۔

پارک پہنچ کر وہ اپنی خاص جگہ پر آئے تو اس وقت سورج گھنے درختوں کے پیچھے چمک رہا تھا۔ پتوں سے چھن کر کرنیں لکیروں کی طرح واضح نظر آرہی تھیں۔ یہ شعاعیں اس لیے بھی واضح ہو رہی تھیں کہ کہیں قریب میں سوکھے پتوں کے ڈھیر میں آگ لگا دی گئی تھی دھواں اُٹھ رہا تھا، فضاء میں عجیب سی بو پھیلی ہوئی تھی۔ ایک اونچے پیڑ کی سوکھی شاخ پر چیل بیٹھی تھی اور مسلسل چلاّ رہی تھی اور اس کا نَر اس کے اطراف اوپر ہی اوپر اس طرح گھوم رہا تھا جیسے ایرپورٹ پر کوئی طیارہ لینڈنگ سگنل کے انتظار میں چکر لگا رہا ہو۔

اس وقت اس نے اس کی کمر پر ہاتھ رکھا وہ جانتی تھی اب دھیرے دھیرے اس کی انگلیاں نیچے اُتر کر اس کی ناف پر رُک جائیں گی اور پھر وہ ناف کے اطراف اُبھری ہوئی جلد کو محسوس کرے گا۔ اس نے وہی کیا ۔ اسے محسوس ہوا جیسے اس کے بچے کا دم گھٹ جائے گا۔ اور اس نے ہاتھ ہٹا دیا۔

''کیوں؟'' اس نے حیرت سے پوچھا۔

''کان لگاؤ یہاں'' اس نے کہا ۔ اس نے کان لگا دیئے۔

''کچھ سنائی دیا؟''

''کیا مطلب؟ وہ جیسے سب کچھ سمجھ گیا ۔ وہ شرما گئی اور انتظار کرنے لگی کہ وہ اسے چوم لے گا۔ لیکن وہ سنجیدہ تھا۔

سورج پتہ نہیں کب اور نیچے اُتر آیا تھا، ایک کرن سیدھے اس کے گال سے ٹکرائی ایک شعلہ سا بھڑکا۔

''تم خوش نہیں ہوئے ......''

''نہیں ایسی بات نہیں ہے......لیکن کیا ہمارے حالات ایسے ہیں کہ......''

''ایک بات سنو گے تو اُچھل پڑو گے''

''کہو''

''یہ ہماری سہاگ رات کی نشانی ہے- ایسا تحفہ بہت کم ملتا ہے نا؟'' اس نے پر جوش انداز میں کہا لیکن وہ اُچھلا نہیں۔

''میں کیری (CARRY) کروں گی'' اس کے لہجے میں ٹھوس ارادہ تھا۔

''لیکن کیسے ہوگا سب کچھ- ہمارا کوئی گھر نہیں۔ دو ایک دوستوں کے علاوہ ہماری شادی کے بارے میں کوئی نہیں جانتا۔ ہم مالی اعتبار سے بھی اتنے مضبوط نہیں ہیں کہ فوراً کوئی انتظام ہو سکے۔ تمھاری دیکھ بھال - ملازمت - پھر تمھاری ممی تو گھر سے نکال باہر کردیں گی ...... کیسے ہوگا......؟ وہ مضطرب ہو گیا۔

''میں سب سنبھال لوں گی''۔

''بی پراکٹیکل جان ......میری تو کچھ سمجھ میں نہیں آرہا ہے ......اور پھر اتنی جلدی بھی کیا ہے۔ ابھی تو ہم سنبھل بھی نہیں پائے ......''

اس نے سمجھایا-

''ساری زندگی حالات نہیں سنبھلیں گے'' اس نے غصے سے کہا اس کی آنکھوں میں آنسو آگئے۔ ایسے ردعمل کی اسے توقع ہی نہیں تھی۔ اچانک ہوا چلی تو خشک پتوں کے ڈھیر میں شعلے بھڑکے......

''پلیز میری بات سمجھنے کی کوشش کرو......'' اس نے دونوں ہاتھوں میں اس کا چہرہ تھام لیا۔ لیکن ایک جھٹکے سے اس نے چہرہ چھڑا لیا......

سورج غروب ہو رہا تھا آسمان لال انگارہ ہو گیا تھا۔ اس کی سرخی کے سامنے درخت کی ٹہنیاں اور پتیاں سیاہ لگ رہی تھیں۔ جیسے وہ سایہ ہوں ......وہ پُل سے آگے بڑھ گئے ...... ''میری بات سنو- دیکھو دنیا کتنی بدل گئی ہے۔ ایک سرکل پورا ہو رہا ہے۔ انسان ماقبل تہذیب جانوروں کی

طرح رہتا تھا۔ ذاتی ملکیت کا کوئی تصور نہ تھا۔ پھر ذاتی ملکیت کا تصور اُبھرا۔ خاندان بنا قبیلہ بنا۔ رشتے ناطے بنے ...... وہ اپنے خاندان میں خوش رہنے لگا۔ پھر یہ خاندان بوجھ ہو گیا سنگل فیملی کا تصور اُبھرا۔ پھر وہ بھی سہارا نہ سکا۔ کنٹریکٹ میرج ہونے لگی ......لیکن اب میرج بھی نہیں۔ عورت اور مرد جب جی چاہتا ہے جنسی تقاضے پورا کر لیتے ہیں......''

''اس کے باوجود بچے ہوتے ہیں اور کوئی احتیاطی تدبیر کام نہیں کرتی وہ بچے جنم بھی دیتے ہیں''۔

اس نے تلخی سے کہا۔

''ہاں لیکن اس کا حل بھی اُنھوں نے ڈھونڈ لیا ہے۔ CHILD FARM ہونے لگے ہیں۔ بچے کو وہاں چھوڑ دیتے ہیں۔

''پولٹری فارم کی طرح۔ کسی بچے کو علم نہیں ہوتا کہ اس کے ماں باپ کون ہیں۔ مجھے پتہ نہیں تھا کہ تم بھی ان لوگوں میں سے ہو جو مرغی اور انسان کے بچے میں فرق نہیں کرتے۔''اس نے غصے سے کہا۔

''میرا یہ مطلب نہیں تھا جان۔ مجھے بھی بچہ چاہئے لیکن ابھی اس کا وقت نہیں آیا۔ کیا ماحول دے پائیں گے ہم اسے۔؟ کچھ دن رُک جاؤ۔''

''دیکھو تم ابارشن پر اصرار کرو گے تو میں ابارشن کے ساتھ آپریشن بھی کروالوں گی''۔

''کیا مطلب؟''

''کر لینا کسی سے جنسی معاہدہ اور چھوڑ آنا اپنے بچے کو چائیلڈ فارم میں''۔

''میری بات تو سنو۔''

''شٹ اپ''اس نے غصے سے کہا اور قدم تیز کر دیئے۔ دونوں پارک سے باہر آ گئے۔ وہ اسکوٹر پر بیٹھی تو اس کے زانو پر ہاتھ نہیں رکھا اور نہ اس سے لگ کر بیٹھی۔ روزانہ وہ پورے وجود کو اس

کے ساتھ مدغم کر دیتی تھی۔اتنا چمٹ کر بیٹھتی تھی کہ راہ چلتے لوگ پلٹ پلٹ کر دیکھتے۔وہ اپنی نشست پر اس کے جسم کی نرمی اور گداز کو محسوس کرنے کا عادی ہو گیا تھا۔لیکن جب وہ اس سے ناراض ہو جاتی تو الگ ہو کر بیٹھتی تھی۔ یہ اس کی خفگی کی علامت تھی- راستہ بھر دونوں نے گفتگو نہیں کی۔اسکوٹر سے اُترتے ہی وہ گھر کے اندر چلی گئی۔اس سے پوچھا بھی نہیں کہ کل وہ کب آئے گا، کچھ دیر وہ رُکا رہا پھر مایوسی سے لوٹ گیا۔

گھر جانے کے بعد وہ لباس تبدیل کئے بغیر بستر پر گر گئی۔کتنا مختلف انسان لگا آج وہ-اس نے سہاگ رات والی نشان کی بات کو اہمیت ہی نہیں دی - بعد میں جنم دیں گے بچے کو- چائیلڈ فارم!! فلاسفی بگھارنا کتنا آسان ہے۔ جیسے ہم مغربی دنیا کا حصہ ہیں۔چائیلڈ فارم تو ہمارے بعد والی نسل بھی نہیں دیکھے گی۔خدانخواستہ یہاں ایسا ہوگا ہی نہیں-ابھی ہماری نانی، دادی زندہ ہیں۔ رشتوں کا احترام باقی ہے-

رفتہ رفتہ اس کا دماغ ٹھنڈا ہونے لگا- ڈھیر سارے برتن اور کپڑے رکھے تھے- ماں کا رویہ-! کیسی ماں ہے اس کی۔گھر کی ملازمہ بنا رکھا ہے۔نوکری بھی کرے اور یہ کام بھی-کب اس جہنم سے نجات ملے گی کب؟ تین برس سے وہ کوشش کر رہے ہیں لیکن الگ سے گھر نہیں لے پائے -اب تو شادی بھی کر لی-لیکن گھر-؟ کہیں اس نے سچ تو نہیں کہا-ایسے ماحول میں وہ کیسے CARRY کرے گی۔ماں تو گھر سے نکال باہر کرے گی۔پھر وہ کہاں جائے گی-گھر؟-اس کی دیکھ بھال کون کرے گا کیسے ہوگا سب کچھ-

اس نے چادر اُٹھائی اور سر سے اوڑھ کر سیدھے لیڈی ڈاکٹر کے پاس چلی گئی۔''فرسٹ بے بی ہے؟''

''جی ہاں''

''رکھ کیوں نہیں لیتیں-؟'' ڈاکٹر نے کہا۔

’’GAP چاہئے-‘‘

’’پہلا بے بی آنے دو پھر GAP رکھنا-‘‘ لیڈی ڈاکٹر نے کہا

’’نہیں-وہ............ ‘‘ ڈاکٹر نے گولیاں لکھ دیں۔ وہ گولیاں لے آئی۔ گولیاں کھانے کے لئے اس نے پانی بھرا گلاس اُٹھایا تو وہی باریک سی آواز آئی-ممی!!

اس کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔اس نے گلاس میز پر رکھ دیا۔

کتنا کہا کرتا تھا کہ دونوں کی نشانی ہونی چاہئے-اِس کے فیچرز، اس کا کلر، اس کی آواز اس کا لہجہ-اس کی شوخی اس کی سنجیدگی، اس کی ذہانت اس کی علمیت-! پھر کیا ہوگیا؟

نہیں، چاہتا تو شاید وہ اب بھی ہے لیکن حالات سنبھلنے کے بعد........ حالات!!

حالات-کیا حالات ایسے تھے کہ دونوں کو نکاح کرنا ضروری تھا؟ کیا سہاگ رات منانا بھی ضروری تھی۔ پھر اب حالات کہاں سے آ گئے-وہ جھلا گئی-

جیسا اب تک ہوتا آیا ہے۔یہ بھی ہوگا۔

لیکن اپنے ماں بننے کی علامتیں وہ کیسے چھپا پائے گی؟ شاید اسی لئے اس نے منع کیا ہو-

اس نے گولیاں حلق سے اُتار لیں-اب وہ باریک سی آواز بند ہو جائے گی۔اس کا دل بھر آیا۔کیسی بدقسمت عورت ہے وہ-صبح وہ ناخنوں کو پالش لگالے گی۔!! لیکن ناخن رنگے بغیر ہی وہ آفس چلی گئی-کام میں دل نہیں لگا۔شام میں وہ اسے لینے آیا وہ چپ چاپ اسکوٹر کی پچھلی سیٹ پر بیٹھ گئی۔کل کی طرح فاصلہ رکھ کے-پارک آ گیا۔

پُل پر ابھی دھوپ تھی وہ اس درخت کے پاس آ گئے جس کی پھلیوں میں سرخ بیج ہوتے تھے پھلیاں سوکھ کر تڑخ جاتیں تو وہ بیج سبز لان پر اِدھر اُدھر بکھر جاتے اور بیر بہوٹی کی طرح جھانکنے لگتے۔ بڑی مشکل سے اُنھوں نے یہ درخت دریافت کیا تھا پورے پارک میں ایسا ایک ہی درخت تھا۔ وہ سرخ بیج اکٹھا کرنے لگی۔ دراصل وہ کانچ کے ایک گلدستے میں سرخ بیج بھر کے اس میں

سرخ گلاب لگانا چاہتی تھی۔ ڈھیر سارے بیج جمع ہو گئے تھے- وہ بھی بیج چننے لگا لیکن آج بہت کم بیج تھے- وہ پُل پر آ گئے-

''بات نہیں کروگی؟'' اس نے پوچھا-

''کیوں ایسا خیال کیوں آیا تمھیں-''

''تمھیں شاید میری کل والی بات، میرا رویہ ٹھیک نہیں لگا-''

''اب اس ذکر کو نہ چھیڑو تو بہتر ہے- وہی ہو گا جو تم چاہتے ہو۔ ہماری کوئی بچہ نہیں ہو گا-''

''میں نے یہ کب کہا''۔

''لیکن میں نے فیصلہ کر لیا ہے کہ میں ابارشن کے ساتھ آپریشن بھی کروالوں گی-''

''تم ایسا نہیں کروگی''۔ اس نے غصے سے کہا

''میں ایسا ہی کروں گی-''

''یہ کیا ضد ہے-'' اس نے جھلا کر کہا'' ۔ اچھا تو پھر کچھ نہ کرو۔ کیری کرلو-''

''فار یور انفارمیشن میں کل ہی لیڈی ڈاکٹر سے مل چکی ہوں اور گولیاں بھی کھا چکی ہوں-''

''اوہ-'' وہ خاموش ہو گیا۔

پھر خاموشی رہی- اس نے ماحول کا تناؤ توڑنے کے لئے ٹی وی سیریئل کا ذکر چھیڑ دیا- پھر دونوں فلموں کی، اپنی اپنی ملازمتوں کی باتیں کرنے لگے، لیکن سب کچھ کتنا مصنوعی اور کھوکھلا سا تھا۔ گولیاں ختم ہو گئیں اتنے دن انتظار بھی کر لیا جتنے دن ڈاکٹر نے کہے تھے لیکن ممی ۔ ممی کی آواز مسلسل آتی رہی۔

وہ لیڈی ڈاکٹر سے ملی۔

''رکھ لو- بڑا ڈھیٹ لگتا ہے'' لیڈی ڈاکٹر نے کہا

''نہیں-'' اس نے سختی سے کہا۔

اس بار انجکشن دیا گیا۔ اسے محسوس ہوا انجکشن کا سیّال پورے وجود میں پھیلتا جا رہا ہے اس کا بچہ اب دم توڑ دے گا۔ وہ رات بھر بے چین رہی۔ روز کی طرح شام وہ پارک آئے تو اس نے نہ اپنی کیفیات بتائیں اور نہ اپنی سوچوں کا اظہار کیا۔

پُل پر دھواں تھا وہ مصنوعی جھیل کے پاس پڑی بنچ پر بیٹھ گئے۔ یہ جھیل کشتی رانی کے لئے بنائی گئی تھی۔ اس کے دونوں کناروں پر ناریل کے درخت جھکے ہوئے تھے۔ جھیل کا پانی گدلا تھا۔ ایک جانب کچرا جمع ہو گیا تھا۔ مینڈک کے بہت سارے بچے پانی کی سطح پر تیر رہے تھے۔ وہ اپنی دم پانی پر مارتے تو دائرے بن جاتے - پانی کی سطح پر کئی دائرے پھیلے ہوئے تھے - جب کوئی کشتی اِدھر سے گزرتی تو سارے دائرے مٹ جاتے وہ بچے پھر سے دائرے بنانے میں مصروف ہو جاتے۔

اس نے اس کا ہاتھ تھام لیا۔ چپکے سے اس کے ناخن دیکھے پالش نہیں تھی - وہ کندھے سے لگ گئی۔ کیسا ٹینشن ہے یہ -؟ اگر حالات اچھے ہوتے تو یہ تناؤ نہ ہوتا دونوں اپنے پہلے بچے کا کتنی خوشی سے استقبال کرتے۔ وہ سچ بھی کہہ رہی تھی کہ ایسا بہت کم ہوتا ہے کہ بچے کے وجود میں آنے کی تاریخ کا پتہ چلتا ہے۔

''بہت TENSION ہے؟ اس نے پیار سے پوچھا۔

اس نے بڑی بڑی آنکھوں سے اس کی جانب دیکھا۔ کچھ نہیں کہا۔

''نہیں - تم کیری کرلو-'' اس نے کہا۔ لیکن وہ چپ رہی۔ واپسی میں وہ اسکوٹر کی پچھلی سیٹ پر بیٹھی تو اس سے چمٹی ہوئی تھی راستے بھر دونوں نے کوئی بات نہیں کی۔

گھر جا کر وہ بستر پر لیٹ گئی -

''ممی -'' باریک سی آواز آئی -

وہ چونکی - تو کیا انجکشن بھی -

وہ لیڈی ڈاکٹر کے پاس بھاگی - دو تین دن انتظار ورنہ M.T.P -!! اس کے علاوہ کوئی

صورت نہ تھی۔ تین دن گزر گئے - آواز آتی رہی - کچھ بھی نہیں ہوا - اس موضوع پر دونوں نے بات بھی نہیں کی - وہ اکیلی سارا کرب جھیلتی رہی -

کل لیڈی ڈاکٹر نے وقت دیا تھا۔ رات بھر وہ کروٹیں بدلتی رہی - پتہ نہیں کیا ہو -

ممی - ممی - !!

اس کا دل بھر آیا - بیٹا ہماری دنیا ایسی نہیں ہے کہ تم آؤ - دیکھو ہمارا اپنا کوئی گھر نہیں ہے - میری اور تمھاری دیکھ بھال کون کرے گا۔ جب میں جاب کرنے چلی جاؤں گی تو تم اکیلے کیسے رہو گے؟ -

''ممی - ممی -'' ایک آواز آتی رہی -

ساری رات وہ جاگتی رہی - صبح اس نے چھٹی کی درخواست بھیجی - پرس میں نوٹ رکھے اور دواخانے آگئی۔ جی بہت گھبرا رہا تھا۔

''اکیلی ہو؟''

''ہاں -''

''ممی - یا ہسبنڈ - ؟

''کوئی فرق نہیں پڑتا -'' اس کے لہجے کو سن کر لیڈی ڈاکٹر چونک گئی۔ اچھا کیا صبح صبح آ گئیں -'' ڈاکٹر نے کہا - جیسے اس لہجے کی چبھن کو سہلا رہی ہو -

اسے آپریشن تھیٹر لایا گیا - ''چپل باہر چھوڑ دیئے'' نرس نے کہا۔ اس نے چپل چھوڑ دیئے۔ عجیب سی کیفیت تھی۔ جیسے کسی مقتل میں جارہی ہو - اسے لٹا دیا گیا - نرس نے ڈیٹال سے پیر دھوئے - کپڑے اُتار کر گون پہننے کو کہا - بال کھول کر سکارف باندھ دیا - اے سی روم تھا لیکن گھٹن سی تھی پورے بدن سے پسینہ پھوٹ رہا تھا۔ ٹھنڈا ٹھنڈا -

''کیا بات ہے'' لیڈی ڈاکٹر نے کہا -

''کچھ نہیں۔''

''اتنا پسینہ کیوں بہہ رہا۔'' لیڈی ڈاکٹر نے دونوں چھاتیوں کے بیچ کی خلا میں بہتے ہوئے پسینے کے قطروں کو انگلی کے پور پر لے کر کہا۔ اب بھی سوچ لو تم۔''

''جی سوچ لیا۔'' اس نے فیصلہ کن انداز میں کہا۔

گلوکوز چڑھانے کے لئے نرس رگ تلاش کرنے لگی۔ بڑی مشکل سے رگ ملی۔ ایک بوتل رکھی تھی۔ یہی بوتل اس کا قتل کرے گی۔ ڈاکٹر نے بے ہوشی کا انجکشن دیا۔ کچھ دیر بعد بوتل دھندلی ہوتی گئی ''تھوڑا نیچے آؤ۔'' ڈاکٹر نے کہا۔ اس کا ذہن ڈوب رہا تھا وہ تنہا تھی بالکل تنہا۔ اس کا اپنا وہاں کوئی نہیں تھا جسے وہ آواز دیتی۔

آواز۔؟

بے ہوشی کا انجکشن دینے کے بعد بھی وہ آواز مسلسل سنائی دے رہی تھی۔

ممی۔ ممی۔

ممی۔ ممی۔

پھر رفتہ رفتہ آواز دور ہوتی گئی۔ آخری بار اس نے وہ آواز سنی تو ایسا لگا جیسے کوئی گہرے کنویں سے پکار رہا ہو۔ پھر اسے ہوش نہیں رہا۔ ہوش آیا تو دیکھا کے کمرے میں اس کے سوا کوئی نہیں ہے۔ ایک سناٹا تھا۔ عجیب سا خالی خالی پن محسوس ہو رہا تھا۔ پھر کوئی آیا۔ ڈاکٹر تھی۔ گھنٹہ بھر آرام کرلو۔ طبیعت سنبھل جائے تو چلی جانا۔'' ڈاکٹر کی آواز سائیں سائیں کر رہی تھی۔ اس کے وجود کا ایک حصہ گم ہو گیا تھا۔ وہ پوری نہیں ہے۔ وہ نامکمل ہے۔ کہیں کچھ کم ہو گیا ہے۔ ڈاکٹر چلی گئی تو وہ جی بھر کے رونے لگی۔ کتنی دیر تک روتی رہی۔ جب ڈاکٹر نے کہلوایا کہ اب وہ جا سکتی ہے تو اس نے آٹو منگوایا اور لڑکھڑاتے قدموں سے چلی گئی۔ وہ سیدھے اپنے کمرے میں جا کر لیٹ گئی۔ ڈریسنگ ٹیبل پر نیل پالش رکھی تھی۔ اس نے نیل پالش کی شیشی اُٹھائی۔ ناخن رنگنے کے لئے ذرا

کھولا تو چکنائی بھرا مادہ باہر آیا - عجیب سی چپچپاہٹ تھی - اس نے برش ناخن پر رکھا تو لگا جیسے تازہ تازہ خون ہو- خون ...... وہ پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔ شاید اس کے بچے کو کنویں میں ڈھکیل دیا گیا ہے۔

شاید وہ محفوظ ہے-کوئی قافلہ اِدھر سے گزرے گا تو اسے باہر نکالے گا......اس کی وجاہت نازک انگلیوں کو زخمی کرے گی ، اور پھر وہ سات مقفل دروازوں کی پرواہ کئے بغیر بھاگے گا تو دروازے خود بخود کھل جائیں گے لیکن قید خانے پر اس کی دوڑ ختم ہوگی- پھر وہ قید خانے سے معبّر بن کر نکلے گا۔اس وقت تک وہ بینائی کھو چکی ہوگی۔اس کا بیٹا اسے اندھیروں سے نکالے گا۔

☆☆☆

کھائی

برف کی سلوں کے درمیان شوکت میاں کی نعش رکھی تھی۔ پنکھا تیزی سے چل رہا تھا۔ برف کے گھلنے سے پانی کی بوندیں فرش پر گر رہی تھیں۔

قرآن کی تلاوت کرتے کرتے کفایت علی نے اپنے باپ کی نعش کی طرف دیکھا وہ فیصلہ نہیں کر سکا کہ اسے اپنے باپ کے مرنے کا افسوس ہے بھی یا نہیں۔ اتنا ضرور ہے کہ وہ ایک طرح کی آزادی محسوس کر رہا تھا جیسے قید سے رہائی ملی ہو۔ اس شخص کی موجودگی میں اسے اپنا وجود نظر ہی نہیں آتا تھا۔ اس شخص نے کبھی اس کی مرضی چلنے نہیں دی تھی۔ کبھی اس کی تعریف نہیں کی تھی۔ ہمیشہ اس کی طرف حقارت ہی سے دیکھتا تھا۔ اس شخص کی موجودگی میں وہ احساس کمتری میں مبتلا ہو جاتا تھا۔ اسے ایک طرح کا سکون محسوس ہونے لگا۔ چلو ایک باب ختم ہو گیا۔ اب اپنے بیٹے کے پیار اور عزت کا مستحق وہی ہے۔

برف کی بوندیں فرش پر ٹپکتی رہیں۔ فرش پر اچھا خاصہ پانی جمع ہو کر بہنے لگا تھا۔ ”کیا مزید

برف کی ضرورت پڑے گی؟'' کسی نے کفایت علی سے پوچھا۔

''نہیں یہی کافی ہو جائے گی''۔ پہلی بار کفایت علی کو اپنے لہجے میں خود اعتمادی اور قطعیت کا احساس ہوا۔ اس میں تعجب کی بات بھی کیا ہے۔ شوکت میاں کے بعد اب خاندان کا سربراہ وہی ہے۔ اب گھر کے سارے فیصلے اسے ہی کرنے ہیں۔

کفایت علی کو اپنے بیٹے کا انتظار تھا۔ فون پر جب اسے شوکت میاں کے انتقال کی اطلاع دی گئی تو اس نے کہا تھا کہ وہ آرہا ہے۔ اس کے آنے تک تدفین نہ کی جائے۔ دنیا کتنی سمٹ گئی ہے چند گھنٹوں میں اس کا بیٹا ہزاروں میل کا سفر طے کر کے آجائے گا۔ فون، فیکس، تیز رفتار ہوائی جہاز چند برسوں میں کتنا کچھ بدل گیا ہے۔ تب نعش کے دونوں جانب برف کی سلیں رکھ دی گئی تھیں۔

شوکت میاں کی نعش کے پاس راجئیا چپ چاپ بیٹھا تھا جیسے وہ روزانہ بیٹھا رہتا تھا۔ اکثر شوکت میاں کی آنکھ لگ جاتی وہ پیروں کے پاس ہی بیٹھا رہتا۔ راجئیا چپکے چپکے رونے لگا۔ عجب آدمی ہے۔ شوکت میاں کا پرانا خدمت گزار دنیا بدل گئی لیکن راجئیا نے ساتھ نہیں چھوڑا۔ ریزرویشن کوٹے میں ڈاکٹری پڑھ کر اس کا بیٹا ڈاکٹر ہو گیا تھا۔ شہر کے مشہور ہسپتال میں ملازمت بھی کر رہا تھا۔ وہی شوکت میاں کا بلڈ پریشر اور شوگر چیک کیا کرتا تھا۔ لیکن راجئیا کو شوکت میاں کے قدموں میں ہی سکون ملتا تھا۔ اور راجئیا کی وجہ سے ہی شوکت میاں اب تک خود کو جاگیردار سمجھتے تھے۔ ورنہ اس دور کا کوئی نشان بھی باقی نہیں تھا۔ راجئیا کے آتے ہی وہ اس کے ساتھ ایک الگ ہی دنیا میں چلے جاتے۔ وہ دنیا جو اُنھوں نے راجئیا کے ساتھ مل کر بنائی تھی۔ دونوں اتنی دور نکل جاتے کہ حال ان کی آنکھوں سے اوجھل ہو جاتا۔ پوری بساط اُلٹ گئی تھی۔ سب کچھ چھن گیا تھا۔ کتنی قیامتیں ٹوٹ پڑیں تھیں۔ کتنی خون ریزیاں ہوئی تھیں۔ کتنے لوگ اپنی زمینیں چھوڑ کر بھاگ گئے تھے لیکن شوکت میاں وہیں تھیں۔ اُنھوں نے اپنی ایک دنیا تخلیق کر لی تھی۔ اس سے باہر نکلنا نہیں چاہتے تھے۔ نہ راجئیا کو پتہ تھا کہ اس کا بیٹا کتنی مصیبتیں جھیل کر ڈاکٹر بنا۔ نہ شوکت میاں جانتے تھے

کہ کتنی دقتوں سے اس نے میٹرک پاس کیا۔ کیسے اس نے راتوں میں جاگ جاگ کر اسٹڈی کی۔ دوستوں کے پاس گھوم گھوم کر نوٹس جمع کئے۔ یکسوئی کے لئے مسجد میں بیٹھ کر پڑھا کیا۔ تیسرے درجے میں ہی سہی۔ فیل تو نہیں ہوا تھا۔ ماں نے کہا تھا کہ وہ اپنے باپ کو خوش خبری سنائے۔ شوکت میاں راجیا کے ساتھ ماضی کی دنیا میں بھٹک رہے تھے۔ کفایت علی دور کھڑا رہا۔

''کیا ہے؟'' بہت دیر بعد شوکت میاں نے پوچھا

''جی میں میٹرک پاس ہوگیا''۔ اس نے رُک رُک کر کہا۔

''شاباش۔ جیتے رہو''۔ شوکت میاں نے کہا اور پھر باتوں میں مصروف ہوگئے۔ وہ سر جھکائے لوٹ آیا۔ کفایت علی کو اپنے باپ سے سخت نفرت ہوئی۔ کبھی اُنھوں نے اس کی تعلیم کی طرف توجہ نہیں کی۔ اس نے اپنی محنت سے کامیابی حاصل کی تو وہ خوش بھی نہیں ہوئے۔ پھر وہ کالج نہیں گیا۔ گھر کے حالات خراب تھے۔ کوئی ذریعہ آمدنی ہی نہ تھا۔ شوکت میاں اپنی کسی عادت کو چھوڑنا نہیں چاہتے تھے۔ پورا گھر اپنی ضرورتیں کاٹ کر ان کی خواہشوں کو احترام کرتا، ناشتے پر بیٹھتے تو اس کی ماں اس عمدگی سے روٹیاں ڈالتی تھیں کہ ایک روٹی ختم ہوئی کہ دوسری گرم روٹی موجود! شوکت میاں کو عمدہ گیہوں کی روٹیاں، خوشبو والے لمبے لمبے چاول، اصلی گھی، شہد، دودھ، زعفران و اصلی مصالحے، خشک میوے چاہئے تھے۔ وہ کم کھاتے مگر عمدہ کھاتے۔ صرف ان کے لئے اہتمام ہوتا۔ باقی افراد تو راشن کے گیہوں اور اوسط قسم کے چاول کھاتے تھے۔ کتنا خودغرض انسان تھا اس کا باپ!

اس نے ٹائپنگ سیکھی۔ ملازمت کرلی۔ کلرک ہوگیا۔ شوکت نواب خوش نہیں ہوئے۔

''اہلکاری کرے گا اُنھوں نے اپنی بیوی سے پوچھا''۔

''پھر کیا کرے گا۔ گلے گلے تک قرض میں ڈوبے ہوئے ہیں۔ گھر کیسے چلے گا''۔

''جیسے اب تک چلتا آیا ہے۔ اس نے رزق دینے کا وعدہ کیا ہے''۔ شوکت میاں نے کہا

شوکت میاں نے اس کی شادی میں بھی دلچسپی نہیں لی۔اس کی شادی بھی کیا ہوئی۔نہ شادی خانے تھے نہ سجاوٹیں۔گھر کے سامنے شامیانہ لگایا گیا۔شطرنجیوں پر چاندنی کا فرش۔سرخ رنگ کا لمبا دسترخوان۔صبح تا نصف النہار کھانے کا انتظام،صبح نکاح ہوااور آدھی رات کو رخصتی ہوئی۔سارا دن دلہن والوں کے گھر پر گزارا۔صبح پہنے ہوئے پھول مرجھا گئے۔ہاں اس کی بیوی خوبصورت تھی اور میٹرک پاس بھی۔سہاگ رات میں اس نے انگریزی میں بات کی تھی اوراس کی بیوی نے انگریزی ہی میں جواب دیا تھا۔شوکت میاں کوبھی بہو پسند آئی۔

بیوی کے آجانے کے بعد کفایت علی کی زندگی میں باقاعدگی آگئی۔شادی کا قرض بھی ادا ہوا۔گھر میں کچھ سامان آگیا۔بس سے دھکے کھاتے ہوئے آفس جانے کے بجائے ایک سیکل بھی خریدنے کا پلان بنا۔اس کی بیوی نے اسے اتنے پیسے دیئے تھے کہ وہ سب سے اچھی کمپنی کی سیکل خرید سکتا تھا۔لیکن اس نے سب سے سستی سیکل خریدی۔سائیکلیں سب ایک جیسی ہوتی ہیں۔اس سے ریڈیو منگوایا گیا۔وہ سب سے غیر معروف کمپنی کا ریڈیو لے آیا اور ثابت کرنے لگا کہ یہ سب سے اچھا ریڈیو ہے۔ماں اور بیوی تو خاموش ہوگئیں لیکن شوکت میاں نے برا سا منہ بنا کر کہا تھا۔

''اہلکارانہ ذہنیت''

''کیا پیسے کی قدر کرنا اہلکارانہ ذہنیت ہے؟'' کفایت علی نے سوچا۔وہ خود سمجھ نہیں پایا تھا کہ کوئی اچھی چیز خریدنے کو اس کا جی کیوں نہیں چاہتا۔کوئی اندر سے روک کیوں لیتا ہے وہ سب سے سستی بلیڈ استعمال کرتا تھا۔کبھی اس نے صابن کی پوری ٹکیہ ہاتھ میں لے کر نہیں ملی تھی۔وہ اپنے ہاتھوں پر صابن لگا کر بدن پر ملتا تھا اور نہاتا تھا۔

اگر وہ سب کچھ نہ کرے تو گھر کیسے چلے؟ شوکت میاں نہ خود کچھ کرتے ہیں نہ اس بات کا اندازہ ہے کہ دنیا کس رفتار سے تبدیل ہورہی ہے۔اپنی مخصوص دنیا میں مگن ہمیشہ اس کی طرف حقارت سے ہی دیکھا کرتے ہیں۔ان کی اس دنیا کے لئے بھی اسی کا پیسہ خرچ ہوتا ہے۔

برف کی پوری ایک سل گھل گئی تھی۔ اس کی جگہ ایک دوسری سل رکھ دی گئی تھی۔ کفایت علی کی بیوی نے بتایا بیٹے کا فون آیا ہے وہ آرہا ہے۔

''بیٹا''

شہزادہ عرفیت تھی۔ اسی نام سے سب بلاتے تھے۔ رونق علی نام رکھا گیا تھا۔ شوکت میاں اسے شہزادہ کہتے تھے۔ شہزادہ تھا بھی بالکل شہزادوں جیسا۔ کفایت علی نے شہزادے کو سب سے اچھے اسکول میں داخل کیا۔ اس کی زندگی میں جو محرومیاں ہیں کم سے کم شہزادے کی زندگی میں نہ ہوں۔ ڈونیشن کے لئے راجیا کام آیا۔

شہزادہ جب ایکشن کے ساتھ نرسری رائمس سناتا تو شوکت نواب کھل اُٹھتے۔ وہ دن بھر تتلا تتلا کر اسکول کے قصے سنایا کرتا۔

شہزادے کے اسکول کی فیس۔ اسکول بس کا کرایہ۔ خرچ بڑھ گیا تھا۔ ہائی اسکول تک تو شہزادہ اچھا رینک لاتا رہا۔ لیکن پھر پتہ نہیں کیا ہوا کہ وہ کئی مضامین میں فیل ہونے لگا۔ ٹیوشن رکھا گیا۔ کفایت علی پر مزید بوجھ بڑھ گیا۔ لیکن شہزادے کو اِن کی کوئی پرواہ نہیں تھی۔ پھر شہزادہ میٹرک میں فیل ہوگیا تو کفایت علی کے پیر تلے سے زمین نکل گئی۔ سارے خواب ٹوٹتے نظر آئے۔ لیکن شوکت میاں کو کوئی افسوس تھا اور نہ شہزادے کو۔ جیسے کچھ ہوا ہی نہیں۔ ایک سلسلہ چل پڑا۔ کتنی بار شہزادہ فیل ہوا۔ کتنی بار کفایت علی نے فیس بھری یاد بھی نہ تھا۔ شہزادہ نکما ہوگیا تھا اور خودسر بھی۔ گیارہ بجے دن تک سوتا رہتا۔ ناشتہ کرنا اور گھر سے نکل جانا۔ شام میں واپسی ہوتی کھانے کے بعد پھر چلا جاتا تو رات کے گیارہ بارہ بجے لوٹتا جبکہ کفایت علی سو چکا ہوتا۔

کئی کئی دن تک اس کی شہزادے سے ملاقات نہیں ہوتی تھی۔ ایک بار جب اس نے شہزادے کو خوب ڈانٹا تو اس نے نہایت سنجیدگی سے کہا۔ ''بابا اس ملک میں دو ہی قسم کے لوگ پڑھ سکتے ہیں ایک وہ جو غیر معمولی صلاحیت رکھتے ہوں اور دوسرے وہ جن کا تعلق بچھڑے

طبقات سے ہو"۔

لیکن ایک انہونی ہوئی ایک دن اس کی بیوی نے اسے بتایا کہ شہزادہ سعودی عرب جارہا ہے۔ پاسپورٹ، ویزااور ٹکٹ سب انتظام ہو چکا ہے۔ کفایت علی کو کسی نے بتایا ہی نہیں یہ سب کیسے ہوا۔ اسے دھکا لگا۔ اس کا اکلوتا لڑکا ہزاروں میل دور جائے گا۔ پھر اس کی بگڑی ہوئی عادتیں؟ وہ سوچتا رہا۔ لیکن شہزادہ چلا گیا۔ محلے کے کچھ نکمّے لڑکے بھی چلے گئے تھے۔ اس کا گھر ہی نہیں محلّہ بھی سونا ہوگیا۔ شوکت میاں پھر سے راجئیا کے ساتھ ماضی کی دنیا میں واپس چلے گئے۔

شہزادے کو جیسے کوئی خزانہ مل گیا تھا۔ وہ ہزاروں روپے گھر بھیجنے لگا۔ ہر آنے والے کے ساتھ کپڑے، روزآنہ استعمال کی چیزیں، ڈرائی فروٹس الگ سے بھیجتا۔ گھر میں ضرورت کی ہر چیز اعلیٰ درجے کی آ گئی۔ دو چار برس میں کایا پلٹ ہوگئی۔

شوکت میاں کے اندر کا جاگیردار بھی انگڑائی لے کر جاگا۔ ان کا ماضی حال میں آ گیا تھا۔ لیکن کفایت علی حیران رہ گیا۔ سخت جدو جہد، ایمانداری اور محنت کے صلے میں اسے کلرکی ہاتھ آئی۔ اورشہزادہ ایک نکما لڑکا۔ پیسے کی مشین بنا ہوا ہے۔ اس کے باپ نے بھی جی بھر کے عیش کیا تھا اور اب بیٹا کر رہا ہے وہ ہی ایک ایسے دور میں پیدا ہوا جہاں کچھ نہ تھا پیسہ کمانے کے مواقع نہ الیکٹرانک گوڈس نہ قسم قسم کے کپڑے۔ نہ طرح طرح کے چاکلیٹس نہ بسکٹیں، نہ پچاسوں قسم کی آئسکریم نہ پیزّا نہ برگر، نہ فاسٹ فوڈ کی دکانیں، ہوٹل میں بیٹھنا اور بازار میں کھانا ہلکے پن کی نشانی تھے لیکن اب بازار میں کھڑے کھڑے کھانا ہی فیشن تھا۔ چند برسوں میں ایک بھونچال سا آ گیا تھا۔ اس کی قسمت میں تو تجنا اور ترسنا ہی لکھا تھا۔

شوکت میاں نے شہزادے کی شادی مشائخ گھرانے میں طے کی۔ جاگیرداروں اور نوابوں کے اجڑنے کے بعد اب یہی مشائخین کے گھرانے دولت کے نئے مراکز تھے۔ جن کے اجداد نے سوکھی روٹیوں پر زندگی گزاری تھی ان کی اولاد کروڑوں میں کھیل رہی ہے۔ شوکت میاں

اپنا دور لے آئے۔ اُنھوں نے بھی جی بھر کے آرزو نکالی۔ شادی خانے کی سجاوٹ ایسی کہ لوگ دیکھتے رہ گئے۔ پورے لوازات اور مغزیات کے ساتھ پکوان ہوئے۔ لوگ اُنگلیاں چاٹتے رہ گئے۔ شہزادہ سچ مچ شہزادہ لگ رہا تھا اور شوکت میاں تو تھے ہی خاندانی جاگیردار۔ سب نے انھیں ہی مبارکباد دی وہ دونوں کے درمیان سے کہیں غائب ہوگیا تھا۔ کسی نے اس پر توجہ ہی نہیں کی صرف اس کے دوستوں نے اسے مبارکباد دی۔

اصل میں شہزادے نے کفایت علی کو بھی پیسہ بھیجا تھا کہ وہ اپنے لئے ایک اچھی شیروانی اور سوٹ بنوالے۔ شیروانی اس نے بنوالی لیکن بہت مہنگی نہیں۔ سوٹ اس نے نہیں بنوایا۔ کس کام آئے گا کبھی پہننے کا موقع نہیں ملتا۔ اس نے سفاری سلوائی۔ شوکت میاں اور شہزادہ دونوں نے اسے حقارت سے دیکھا تھا۔

''اہلکارانہ ذہنیت'' شوکت میاں بڑبڑائے تھے۔

شہزادہ کافی مقروض ہوگیا تھا لیکن اسے ذرا بھی غم نہیں تھا۔ مائی گرینڈ پا از ریئلی گریٹ! دلہن بھی جیسے کانچ کی بنی نازک اور خوب صورت۔ شہزادہ بے حد خوش تھا۔ شادی کے بعد ہفتہ بھر کا ہنی مون۔ ہوائی جہاز کا سفر، اوٹی۔ پانچ ستارہ ہوٹل۔ شہزادہ آندھی کی طرح آیا تھا۔ گھر پر کرایہ کی موٹر ایک ڈرائیور کے ساتھ آگئی۔ ایک ڈبل ڈور فریج آگیا۔ چھوٹے فریج میں صرف کولڈ ڈرنکس اور منیرل واٹر کی بوتلیں بھری رہتیں۔ ہر تھوڑی بعد کول ڈرنک چاہئے۔ شہزادہ جتنی بوتلیں دن بھر پی جاتا اتنی کفایت علی نے پوری عمر میں نہیں پی تھی۔ گھر میں صاف ستھرا پانی تو تھا ہی پھر یہ بوتلیں؟ اس کی کچھ سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ گھر میں کیا ہورہا ہے۔ وہ خاموش تماشائی بنا رہا۔ شہزادہ شوکت میاں کے پاس بیٹھ کر عرب ممالک کے قصے سناتا تو انھیں محسوس ہوتا جیسے قرون وسطیٰ کا دور واپس آگیا ہے۔ ان کے پوتے نے ان کے ماضی کو حال سے جوڑ دیا تھا۔ شہزادے نے کہا کہ وہ انھیں حج کرائے گا۔ شوکت میاں کو فریضۂ حج کی ادائیگی سے زیادہ اِن افسانوی شہروں کو دیکھنے کا شوق تھا۔

شہزادہ لوٹ گیا۔ اس کی بیوی میکے چلی گئی۔ گھر پہلے جیسی حالت میں لوٹ آیا۔ شوکت میاں چپ سے رہنے لگے تھے۔ صرف راجئیا سے کچھ باتیں کر لیتے۔

کل صبح اُنھوں نے دل میں درد کی شکایت کی اور دواخانہ لے جانے تک راستے ہی میں ان کا انتقال ہو گیا۔

کفایت علی نے قرآن کو بند کیا اور آنکھوں سے لگا کر رحل پر رکھا وہ ایک لفظ بھی نہیں پڑھ سکا تھا۔ برف کی ایک سل گھل گئی تھی۔ اس نے دوسری سل رکھوادی۔

شہزادہ آ گیا اور اپنی بیوی سے مل کر رو رہا تھا۔ شہزادے کے ساتھ اس کے خسر، شہر کی مشہور درگاہ کے سجادہ نشین بھی تھے۔ وہ خسر کے شانے پر سر ٹکا کر رونے لگا۔ وہ آہستہ آہستہ اس کی پیٹھ تھپتھپا کر صبر کی تلقین کرنے لگے۔ وہ وہیں کھڑا تھا۔ اس کا دل بھی بھر آیا۔ آخر شوکت میاں اس کے باپ تھے۔ شہزادے نے ایک نظر اس پر ڈالی اور خسر کے ساتھ آگے بڑھ گیا اس کے دل پر گھونسہ سا لگا۔

صبح ہو گئی تھی۔ محلے کے قبرستان میں قبر تیار کرنے کے لئے وہ کل ہی کہہ آیا تھا۔ قبر تیار ہو چکی ہو گی۔ شہزادہ اپنے خسر کے ساتھ کہیں چلا گیا تھا۔ دو تین گھنٹے بعد وہ لوٹا۔ اسے پتہ چلا کہ شہزادہ بڑی مشکل سے اپنے خسر کا رسوخ استعمال کر کے خطہ صالحین میں جگہ حاصل کر سکا ہے۔ جہاں بڑے بڑے بزرگان دین، نواب اور جاگیردار دفن تھے۔

کفایت علی تذبذب میں پڑ گیا کہ آخر اس قبر کا کیا ہو گا جو اس نے تیار کروائی تھی۔ شہزادے سے بات کرنے کا موقع ہی نہیں مل رہا تھا۔ پھر ٹرک آ گیا۔ شہزادہ اپنے خسر کی چمکتی ہوئی ''لمبی کار'' میں سوار ہو گیا۔ اس کے دوسرے سسرالی رشتہ دار مختلف کاروں اور وینوں میں بیٹھ گئے۔ وہ چپ چاپ کھڑا رہ گیا۔ پتہ نہیں کس نے ٹرک میں سے ہاتھ بڑھایا اور کس نے اسے بیٹھنے میں مدد کی۔ وہ سوار ہو گیا۔ قبر میں شہزادہ ہی اُترا اس کے خسر تدفین کے مراحل سمجھانے لگے۔ کفایت علی بھیڑ سے

الگ ایک پکی قبر کے چبوترے پر بیٹھ گیا۔اس کے قریب اس کے آفس کے دو چار دوست آ گئے۔
ہر طرف شہزادہ ہی شہزادہ تھا۔لوگ یہ بھول گئے کہ اس کے باپ کا انتقال ہوا ہے۔

شہزادے کی تعریفیں ہو رہی تھیں ''مرحوم نے جس شان سے زندگی گزاری تھی اسی شان سے آخری سفر بھی طے کیا۔پوتے نے حق ادا کر دیا۔کیا شوکت میاں کا کوئی بیٹا زندہ نہیں ہے؟ کسی نے پوچھا! پتہ نہیں۔کسی نے جواب دیا۔اس کے دل پر پھر ایک بار گھونسہ سا لگا۔قبر مٹی سے ڈھانک دی گئی۔چالیس قدم پر رُک کر فاتحہ پڑھی جا رہی تھی۔

اس قبر کا کیا ہوگا؟۔چار یا پانچ ہزار روپے لگ جائیں گے۔کفایت علی نے سوچا۔سب گھر لوٹ آئے۔سوگوار ماحول میں پھر سے سسکیاں اور رونے کی آوازیں گونجنے لگیں۔

کفایت علی جس بات سے ڈر رہا تھا وہی ہوا۔محلے کے قبرستان کا آدمی آیا ہوا تھا۔

''معلوم ہوا ہے تدفین خطہ صالحین میں ہوئی ہے''۔آدمی نے اس سے پوچھا۔

''جی''

''پھر اس قبر کا کیا ہوگا''۔

''مزدوری لے لینا''۔کفایت علی نے سوچا سمجھا ہوا جواب دہرایا۔

لیکن وہ آدمی اَڑ گیا کہ پورا پیسہ لے گا۔بحث بڑھی آواز اونچی ہوئی۔

شہزادہ ڈرائنگ روم میں اپنے سسرالی رشتہ داروں کے ساتھ بیٹھا مرحوم کے اوصاف بیان کر رہا تھا۔

وہ غصے میں باہر آیا۔

''کیا ہے؟''

قبرستان والے آدمی نے سارا ماجرا سنایا۔

''کتنے پیسے ہوئے'' شہزادے نے پوچھا۔

''بیٹا صرف مزدوری دینا ہے''۔کفایت علی نے آہستہ سے کہا۔

''بابا! گھر رشتہ داروں اور مہمانوں سے بھرا پڑا ہے اور آپ ایک معمولی سی بات پر اُلجھے ہوئے ہیں''۔شہزادے نے جھلا کر کہا۔کفایت علی کو محسوس ہوا جیسے شوکت میاں زندہ ہو گئے ہوں۔ شہزادہ جیب سے پیسہ نکال کر دینے لگا۔

''بیٹا تم میری بات سنو تم سارے پیسے کیوں دے رہے ہو؟''۔

آخر وہ قبر ہما سے کس کام آئے گی؟ کفایت علی نے بے بسی سے کہا

''آپ کے کام آئے گی''شہزادے نے جھلا کر کہا۔

کفایت علی کا سر چکرا گیا۔اس نے سنبھلنے کی کوشش کی لیکن اسی برف کی سل پر گر پڑا جو صحن میں رکھی تھی وہ ٹھنڈک میں دور تک اُترتا چلا گیا۔

☆☆☆

چکرویو

دھرت راشٹر نے پوچھا۔

''اے سنجے مجھے بتاؤ اتنے سارے لوگ اپنے اپنے ہاتھوں میں ہتھیار اُٹھائے اس سرزمین پر کیا کررہے ہیں؟''

سنجے جواب دیا۔

''اے دھرت راشٹر۔ وہ لوگ ایک جاتی کو نشٹ کردینا چاہتے ہیں۔ انھیں صفحۂ ہستی سے مٹادینا چاہتے ہیں''۔

''کیا ایسا ممکن ہے سنجے...... کیا ایسا ممکن ہے؟ کیا ایسا کبھی ہوا تھا؟ کیا ایسا ہوسکتا ہے؟ کیا ایسا ہوگا؟''

''ایسا ہوتا ہے دھرت راشٹر۔ وہ سمجھتے ہیں وہی اس دھرتی کے پتر ہیں۔ دوسروں کو یہاں نہیں رہنا چاہئے۔ وہ اکثریت میں ہیں اس لئے وہ انھیں اوران کی نشانیوں کو مٹادینا چاہتے ہیں۔

اُنھوں نے پوری جاتی کو خوف زدہ کر دیا ہے۔ ذرا تصویر دیکھئے۔ کتنا خوف ہے اس کی آنکھوں میں ......موت کا خوف......وہ کس طرح دونوں ہاتھ جوڑے زندگی کی بھیک مانگ رہا ہے''۔

''تصویر نہیں سنجے۔ ہمیں پورا منظر دکھاؤ''۔

''کون سا منظر دکھاؤں؟ دھرت راشٹر۔ منظر ہی منظر ہیں۔ بلکتے بچوں کا منظر، آگ میں جلتے ہوئے جسم، تنوروں میں جلتے بدن، اپنی عصمت کا ماتم کرتی ہوئی عورتوں کا منظر، عبادت گاہوں کا ملبہ، خاک کا ڈھیر بنی عمارتیں، اُجڑے بازار، سڑتی ہوئی لاشیں......اُنھوں نے کسی کو نہیں چھوڑا دھرت راشٹر! نہ علاج کرنے والوں کو، نہ زخمیوں کی مدد کرنے والوں کو، نہ انصاف کرنے والوں کو اور نہ مزدوروں کو......آگ ہی آگ ہے......چاروں اور آگ ہے''۔

''ہاں! میں وہ آگ دیکھ رہا ہوں۔ آگ جس نے سب کچھ نگل لیا ہے۔ میں آوازیں سن رہا ہوں۔ مارو، کاٹو، جلاؤ......ان میں خوف زدہ چیخیں اور بلکتی ہوئی آوازیں اور سسکیاں بھی ہیں، کیسا عجب سا شور ہے''۔

کرشن نے کہا تھا......اس جہنم کے تین دروازے ہیں۔ شہوت، غصہ اور طمع۔ یہ روح کو تباہ کر دیتے ہیں۔ یہی دروازے کھل گئے ہیں دھرت راشٹر!''

''سمئے کے ساتھ ساتھ پرمپرا بھی بدلتی ہے سنجے......ایک نیا اتہاس وجود میں آتا ہے''۔

''اے دھرت راشٹر...... یہ منظر دیکھئے، اتہاس اس منظر کو جنم دینے والے کے بارے میں کیا لکھے گا۔ یہ تو آنے والا سمئے ہی بتائے گا۔ یہ شہر کی ایک خوب صورت کالونی ہے۔ یہاں سب اقلیتی فرقے کے افراد رہتے ہیں۔ ان میں ایک بہت عزت دار آدمی بھی ہے جو اقتدار کے ایوان میں بیٹھا کرتا تھا۔ اس آدمی نے انھیں یہاں مکانات بنانے اور یہاں رہنے کی ترغیب دی تھی۔ اطراف میں اکثریتی فرقے کے لوگ رہتے ہیں۔ لیکن وہ سب شریف آدمی ہیں۔ انھیں یقین تھا کہ کسی بھی ناگہانی صورتحال میں وہ عزت دار آدمی انھیں بچالے گا۔ اپنا اثر ورسوخ استعمال کرے گا۔

سورج نکلنے کے بعد سے وہ پریشان ہیں۔صبح ایک ذمہ دار محافظ عزت دار آدمی کے گھر آتا ہے۔ کچھ اس کے ساتھی بھی ہیں۔ وہ اسے تیقن دیتے ہیں کہ وہ محافظوں کو بھیج دیں گے۔ان کی مکمل حفاظت کی جائے گی۔اس کے چہرے پر اطمینان ہے لیکن اِن لوگوں کو گئے ہوئے پانچ منٹ بھی نہیں ہوئے کہ ایک روٹی کی دکان اور تین پہیوں کی ایک سواری جلادی گئی۔آدھا گھنٹہ بعد پتھر پھینکے جانے لگے۔تمام مکین سہم کر عزت دار آدمی کے گھر جمع ہو گئے۔عزت دار آدمی کی اُنگلیاں مسلسل حرکت میں ہیں۔ وہ کوئی نمبر بار بار ملا رہا ہے یا کئی نمبر ملا رہا ہے۔لیکن کوئی نمبر نہیں ملتا۔ایک اضطرابی کیفیت ہے۔ بے چینی ہے، محافظوں کا دور دور تک پتہ نہیں۔وہاں ایک ہی مکان دوسرے فرقے کا ہے۔اُنھوں نے اپنا گھر ہجوم کے حوالے کردیا ہے۔اب گھروں پر سنگ باری زیادہ آسان ہے۔عقبی حصے سے بھی پتھر، ایسڈ بلب، کیروسین کی بوتلیں، پٹرول بم پھینکے جارہے ہیں۔ سورج سر پر آگیا ہے۔ہجوم ایک شخص کو گھیرے ہوئے ہے۔ پتہ نہیں وہ وہاں کیسے پھنس گیا۔وہ اس پر چھپٹے۔تلوار چمکی، اس کا جسم تین ٹکڑوں میں کٹ گیا۔ جئے ......ان کے نعرے میں جوش ہے۔

آگ کا ایک الاؤ بہت پہلے ہی تیار کرلیا گیا ہے۔جسم کے وہ ٹکڑے آگ میں جھونک دیئے گئے۔

چر...... چر...... چر......تازہ گوشت کے جلنے سے عجیب سی بو پھیل گئی۔آگ، شعلے، دھواں، جلتے گوشت کی بو، پتھروں کی بارش ......عجیب خوف ناک فضا ہے۔عزت دار آدمی اور دوسرے خوف زدہ ہیں۔ان کی کالونی کا مضبوط آہنی گیٹ ہجوم نے توڑ دیا۔

''گھس جاؤ......''ہجوم نے حلق پھاڑ کے آواز لگائی۔

عزت دار آدمی کی اُنگلیاں درد کرنے لگیں لیکن کہیں رابطہ قائم نہیں ہوا۔سارے نمبر بے معنی ہوگئے ہیں۔انگلیاں شل ہوگئیں ہیں۔تمام اعضاء شل ہوتے جارہے ہیں۔وہ سب اس کی طرف دیکھ رہے ہیں۔ان کی آنکھوں میں مایوسی اور بے بسی اُتر آئی تھی۔ جلتے ہوئے آگ کے گولے اور

پتھر اِن کی چھتوں اور دیواروں سے ٹکرار ہے تھے۔ وہ ایک اور شکار پکڑ لائے ......تلواریں اُٹھیں اور جسم ٹکڑوں میں بکھر گیا۔ گوشت کے ٹکڑے آگ میں پھینک دیئے گئے۔

وہی بو سارے ماحول میں پھیل گئی، موت کی بو، فنا کی بو...... بو بھی کتنی وحشت ناک ہوتی ہے۔

سورج عروج پر پہنچ کر ڈھلوان میں اُتر رہا تھا...... اب وہ ان کے گھروں تک پہنچ گئے ہیں۔ سروں کا ایک لا متناہی سلسلہ ہے۔ تلواریں، گپتیاں، لاٹھیاں ......گھروں کے دروازے ٹوٹنے لگے ہیں۔ عورتوں کو محفوظ کمروں میں چھپا دیا گیا ہے۔ مرد آنے والے خطرہ سے خوف زدہ بے چینی سے ٹہل رہے ہیں۔ اچانک وہ گھس پڑے اور مردوں کو بڑی بے دردی سے کھینچا جار ہا ہے......ہجوم اِن کے ٹکڑے کر رہا ہے۔

فضا میں نعرے گونج رہے ہیں

بے رحمی، سفاکی، آنکھوں میں خون، خوف زدہ چیخیں، بے بس خاموشی، بے عزتی...... عورتوں کے لباس ریزہ ریزہ ہوئے۔ عصمتیں تار تار ہوئیں، شفاف جسم داغ دار ہوئے، وہ جسم جن کی جھلک بھی کسی نے نہ دیکھی تھی، انھیں سڑکوں پر بھنبھوڑا جا رہا ہے۔ آہ و بکا، چیخیں، آنسو، جسم ہوس کا ساتھ نہیں دے پا رہے ہیں، جھلاہٹ، جسم کے ٹکڑے ٹکڑے پھر آگ۔

چڑ...... چڑ......وہی عجیب سی وحشت ناک بو۔

تیسرا پہر۔ کوئی محافظ نہیں آیا۔ سورج نیچے آ گیا ہے۔ بالآخر عزت دار آدمی تک وہ پہنچ گئے۔ وہی ان کا اصل شکار ہے۔ وہ بری طرح ٹوٹ پڑے۔ اسے دھکے مار کے باہر نکالا گیا...... اسے بے لباس کرنے میں چند لمحے لگے۔ وہ مادر زاد برہنہ ہو گیا۔ وہ چیخ چیخ کر اس سے مطالبہ کرنے لگے۔

وہ مخصوص الفاظ کہلوانا چاہتے تھے لیکن.....اس کی زبان گنگ تھی۔

''بول...... جۓ شری رام...... بول......'' وہ چپ رہا۔

ان کا اصرار بڑھتا جارہا تھا۔ لیکن اس کی زبان پر تالے پڑے تھے۔ جھلا کر اُنھوں نے اسے تھپڑ اور گھونسے لگائے۔ لاتوں سے مارا۔ پھر ایک ہتھیار چمکا۔ اس کے ہاتھوں کی اُنگلیاں کاٹ دی گئیں۔ انگلیاں جن کے سہارے وہ نمبر گھما کر مدد مانگ رہا تھا۔ تحفظ چاہتا تھا۔ خون تیزی سے بہنے لگا۔

''بول...... بول......'' مغلظات کا طوفان اُبل پڑا...... اس کے جسم کو جگہ جگہ سے زخمی کیا گیا۔ اس کے پورے بدن سے خون بہنے لگا۔ جسم سے ٹپکتا خون۔ بے لباس بدن...... اس کے پیروں کے اگلے حصے کاٹ دیئے گئے۔ وہ بار بار گرتا رہا۔ جب وہ بالکل چلنے کے قابل نہیں رہا تو ایک طرف لڑھک گیا۔ تب ایک تیز دھار والا ہتھیار اس کی گردن میں دھنسا دیا گیا۔ اسے نجات مل گئی۔ اس کے جسم کو گھسیٹ کر درمیان میں لایا گیا۔ اس کے جسم کے تین ٹکڑے کئے گئے اور پھر آگ کا الاؤ

چڑ...... چڑ...... وہی بو...... انسانی گوشت کے جلنے کی بو......

''دیکھا دھرت راشٹر؟''

''ہاں...... دیکھا...... ایسا بالکل پہلی بار دیکھا ہے۔''

''اے دھرت راشٹر اب آپ کیا کریں گے؟''

''میں تو مکھوٹے بدلتا رہتا ہوں سنجے...... پتہ نہیں کون سا مکھوٹا لگانا پڑے''

''اے دھرت راشٹر کرشن...... کرشن نے ارجن سے کہا تھا...... اے بھارت! تمام جان دار آغاز میں نامعلوم، درمیان میں معلوم اور مرنے کے بعد پھر نامعلوم ہوتے ہیں۔ جب سب کی حالت ایسی ہے تو افسوس کس بات کا ہے؟''

۲

''دھرت راشٹر ایک بہت ہی انوکھا منظر ہے۔ نہ ماضی میں ایسا کوئی منظر دیکھا، نہ حال میں۔ مستقبل...... مستقبل کس نے دیکھا ہے۔ ایسا منظر دھرت راشٹر کہ ردر، وسو، سادھیہ، آدتیہ، وشو ، اشون، مروت، اشمپ، گندھر، یکھش، سدھ امور، سب متحیر ہیں۔ سارے بھگوان حیرت زدہ ہیں۔ دیوتاؤں نے ایشور سے کہا تھا وہ منش کو نہ بنائے، وہ ہنگامہ کرے گا۔ لیکن اتنا ہنگامہ کرے گا یہ شاید دیوتا بھی نہیں جانتے تھے......''

''کیا ہو سنجے......؟''

''اے دھرت راشٹر...... یہ غریبوں کی بستی ہے۔ یہاں بھی ہجوم ہے۔ ان کے ہاتھوں میں ہتھیار ہیں۔ ان کے ساتھ محافظ بھی ہیں۔ جو انھیں روک نہیں رہے بلکہ ان کی مدد کر رہے ہیں۔ وہی نعرے...... ویسا ہی شور...... آگ کا الاؤ روشن ہے۔ یہاں ایک عبادت گاہ بھی ہے، پچھڑی جاتی کے یہ لوگ عبادت کرتے ہیں۔ دیکھتے ہی دیکھتے عبادت گاہ مٹی کے ڈھیر میں تبدیل ہوگئی۔ مقدس کتاب کے صفحات بکھرے ہوئے ہیں۔ ایشور کی شکل بدل دی گئی۔ دیکھئے دھرت راشٹر وہ کتنی مہارت سے ایک ہی وار میں ٹکڑے کرتے ہیں۔ عورتوں کو بے لباس کرتے ہیں۔ بے بس عورتوں کو جہنم میں ڈھکیل رہے ہیں۔ ننگا کھیل جاری ہے۔ ایک کے بعد ایک مردانگی کا ثبوت دے رہے ہیں۔ پوری بستی ڈھیر ہوتی جا رہی ہے۔ آگ اور دھواں ہے۔ یہ منظر دیکھئے دھرت راشٹر۔ میں اسی منظر کی بات کر رہا ہوں''۔

''سنجے وہ تو گر بھ وتی ہے، پورے نو مہینے کی گر بھ وتی''۔

''ہاں دھرت راشٹر۔ وہ اسی عبادت گاہ کے سامنے والے مکان میں رہتی ہے...... وہ کتنا گھگھیا رہی ہے۔ اسے چلنا کتنا دوبھر ہو رہا ہے۔ اسے بے لباس کیا جا رہا ہے......''

''اوہ...... وہ مر جائے گی سنجے''۔ دھرت راشٹر بے چین ہو گئے۔

''مرنا تو اس کا مقدر ہے۔ دھرت راشٹر......! لیکن یہ کیسی موت ہے۔ وہ سب اس پر پل پڑے ہیں۔ وہ ہاتھ جوڑے بھیک مانگ رہی ہے۔ وہ بے دم ہوگئی ہے۔ بالکل بے جان...... جگہ جگہ سے خون رس رہا ہے۔ اچانک وہ راکشس تلوار لے کر آگے بڑھا۔ وہ دیکھئے۔ کتنی مہارت سے اس نے گربھ وتی کا پیٹ چیرا ہے...... دھرت راشٹر! بچہ باہر نکل آیا ہے، بچہ زندہ ہے۔ زندہ ہے وہ...... دھرت راشٹر یہ کیسا جنم ہے۔ ابھی ماں کے جسم کو داغ دار کیا گیا۔ لیکن بچہ کیسا بے داغ اور شفاف ہے''۔

''وہ اس کا کیا کریں گے سنجے...... کیا ہوگا اس کا''۔

''دیکھئے...... اس نے بچے کو آگ میں اُچھال دیا ہے...... کتنی مختصر زندگی ہے دھرت راشٹر آگ میں جلنے والا سب سے کم عمر آدمی...... بس ایک لمحہ اس نے زندگی جی لی۔ اب اُنھوں نے ماں کے بھی ٹکڑے کر دیئے...... اچھا ہی کیا...... وہ تو ویسے ہی مر گئی تھی...... ظلم کی تاریخ میں ایک نئے پنے کا اضافہ ہوا ہے گرودیو......

''...... آپ کی آنکھوں میں آنسو...... دھرت راشٹر''۔

''ہاں سنجے ...... کبھی کبھی ایسا بھی ہوتا ہے۔ میں تو سب کے لئے ہوں۔ سب کے لئے......''

''پرہلاد کے لئے آگ گلزار بن گئی تھی دھرت راشٹر...... کیا معصوم کے لئے بھی؟''

''پتہ نہیں سنجے...... اس یگ میں ایسا کچھ نہیں ہوتا......''

''پھر آپ کیا کچھ کریں گے؟''

''میں کیا کر سکتا ہوں۔ میں حالات کے مطابق اپنا مکھوٹا بدل لیتا ہوں۔ جب بھائی کے مقابلے میں راج پاٹھ سے محروم کیا گیا تب بھی میں نے کچھ نہیں کیا۔ راج پاٹھ ملا تو میں نے مکھوٹا بدل لیا۔ میں شکونی کی سازش کو روک سکا نہ دروپدی کے وستر ہرن کو...... تو اِن استریوں کے وستر

ہرن کو کیا روک سکتا ہوں۔ میں دریودھن کو روک سکا نہ یدھ کو روک سکا۔ میں نہ تو رتھ یاترا روک سکا ،نہ عبادت گاہ کو مسمار کرنے سے روک سکا۔ میں تو خاموش تماشائی ہوں۔تماشا بھی تمہارے ذریعے دیکھتا ہوں''۔

''آپ کس طرف ہیں دھرت راشٹر؟''

''میں تو ہمیشہ اکثریت کی طرف رہا۔ چاہے اُنھوں نے کتنا ہی انیائے کیا ہو''۔

''دھرتی کے اس ٹکڑے پر آپ نے جن کو راج کرنے بھیجا تھا اس موذی نے راکھشس کا روپ دھارن کرلیا ہے۔اس نے چن چن کر ایک ہی جاتی کے لوگوں کو ختم کروایا ہے''۔

''ہم اس سے کہیں گے کہ وہ دھرم راج کرے،دھرم راج......''

''دھرت راشٹر! کرشن نے کہا تھا......تکبر،طاقت،اُکھڑپن،شہوت اور غضب کے بندے ہوکر یہ کینہ پرور اپنا بُرا کرتے ہیں ۔اس لئے کہ میں ہی سب میں موجود ہوں''۔

''تم بار بار کرشن کا ذکر کیوں کر رہے ہو۔کیا کرشن پیدا ہو گیا؟''

''اس یگ میں ایسا کچھ ہونے والا نہیں ہے۔دھرت راشٹر۔ یہ آپ نے ہی کہا ہے''۔

''سنجے یہ کیسا شور ہے''۔

'' کچھ لوگ ہیں جو شور مچا رہے ہیں۔اُنھوں نے بھی وہ سارے منظر دیکھے ہیں''۔

''پھر وہ شور کیوں کر رہے ہیں؟''

''اس لئے دھرت راشٹر کہ ان کے اندر انسان زندہ ہے......اب لفظ تصویر بن جاتے ہیں اور تصویریں گھر گھر پہنچ جاتی ہیں۔ظلم کو چھپانا اب ممکن نہیں''۔

''لیکن شور تو ہمارے درباری کر رہے ہیں۔وہ بھی جنھوں نے ہمارا سنگھاسن اپنے کندھوں پر اُٹھائے رکھا ہے''۔

''ہاں دھرت راشٹر......وہ بھی انسان کا مکھوٹا لگانا چاہتے ہیں''۔

''تو کیا وہ ہمارا سنگھاسن گرا دیں گے؟''

''آپ دربار لگائیں دھرت راشٹر''۔

دربار لگا۔ باہر کی آوازیں سچی تھیں۔ لیکن دربار کے اندر چیخنے والوں کی نظر سنگھاسن پر تھی...... بار بار اس گربھ وتی اور بچے کی دہائی دی جا رہی تھی۔ شور بڑھتا جا رہا تھا۔ جب شور بہت بڑھ گیا تو اس راکھشس نے جس کا خمیر سور کی لید سے اُٹھا تھا اور جسے دھرت راشٹر نے سپاہیوں کا محافظ بنایا تھا اور جو اِن کے وستر اور ہتھیار بیچ بیچ کر اپنا گھر بھر رہا تھا۔ اس نے اونچی آواز میں کہا ''یہ کوئی نئی بات نہیں ہے۔ ایسا یگ یگ سے ہوتا آیا ہے''۔ سب کانپ گئے اور دربار میں سناٹا چھا گیا۔

اتہاس لکھنے والے نے اس سارے واقعے کو اسطرح قلم بند کیا ہے۔

''اس یگ کی شناخت ہٹ دھرمی، بے حیائی اور بے ضمیری ہے''۔

۴

سنجے اس بار بھی ہم جیت گئے۔ ہمارا مکھوٹا کام آیا۔ تم جانتے ہو ایسا کیوں ہوا؟ دھرت راشٹر نے ٹھنڈی سانس بھر کے کہا۔

''ہاں دھرت راشٹر...... ان میں کوئی ارجن کوئی کرشن نہیں ہے...... جو چیخ رہے ہیں وہ ڈھونگ ہے جو مظلوم ہیں ان کی آوازیں حلق میں پھنسی ہوئی ہیں۔ جو واقعی ایمان دار ہیں اُن کا آپ کے دربار میں داخلہ بند ہے۔

''چلو یہ مرحلہ بھی طے ہوا...... ہم نے مکھوٹا بدل کر حالات پر افسوس بھی کیا یہ بھی کہا کہ ایسا دوبارہ نہ ہونے پائے۔ ہم نے خزانے سے بہت سا دھن دینے کا بھی وعدہ کیا ہے۔ اب چیخنے والوں کی آوازیں مدھم پڑ جائیں گی''۔

''آپ دوبارہ ایسا ہونے سے روک نہیں پائیں گے، وہ موذی ان تک دھن پہنچنے نہیں دے گا، کئی راکھشس منہ کھولے کھڑے ہیں۔ ہاں چیخنے والوں کی آوازیں مدھم ضرور

پڑ جائیں گی''۔

''سنجے ہمیں ذرا وہ منظر دوبارہ دکھانا ......ان کے خوف زدہ چہروں اور بے بس آنکھوں کو دیکھ کر ہمیں ہمارا بھوش روشن دکھائی دیتا ہے''۔

دیکھئے دھرت راشٹر وہ سب آسماں کے نیچے بیٹھے ہیں۔آگ نے ان کا سب کچھ جلا دیا ہے۔وہ سڑی ہوئی لاشوں کو، بے چہرہ جسموں کو مٹی میں دبا آئے ہیں۔وہ اپنوں کے لئے رو چکے۔ زندگی سوال بن کر کھڑی ہے۔''

''لیکن سنجے''۔دھرت راشٹر بری طرح چونکے''ان کے ہونٹوں پر مسکراہٹ کیسی؟''

''دیکھئے اِدھر دیکھئے ......زمین پر ......ان ننھے بچوں کو دیکھئے جو کھلے آسمان تلے ابھی ابھی خاک سے نکلے ہیں۔زندگی نے دوبارہ جنم لیا ہے۔زندگی کے اس سچے روپ نے ان کے ہونٹوں پر مسکراہٹ بکھیر دی ہے گرودیو۔''

''یہ بچے؟''دھرت راشٹر بے چین ہو گئے ...... ہر خوف سے بے نیاز مسکراتے چہرے جیسے اِنھیں چڑا رہے ہوں۔

''زندگی کو ختم کرنا بہت مشکل ہے دھرت راشٹر۔زندگی کی جڑیں بہت گہری ہوتی ہیں۔کبھی سب کچھ ختم نہیں ہوتا۔کہیں کچھ بچ رہتا ہے۔جو بچ جاتا ہے وہی نجات کا مژدہ لے کر آتا ہے......'' سنجے نے کہا۔

دھرت راشٹر نے چپ سادھ لی وہ بہت تھک گئے تھے۔

☆☆☆

درد کے خیمے

جیسے ہی پلین نے لینڈ کیا میں نے بے ساختہ گھڑی پر نظر ڈالی۔صرف دیڑھ گھنٹے کا سفر۔ دیڑھ گھنٹے کا یہ فاصلہ میں نے پورے تیس سال میں طے کیا تھا۔ضروری اُمور کی تکمیل کے بعد سب نے منتظر چہرے تلاش کر لئے اور تیزی سے روانہ ہو گئے تھے۔ میں وقت کی جس منزل پر رُکا اس چہرے کو تلاش کر رہا تھا وقت اُس سے کہیں آگے بڑھ گیا تھا۔کھچڑی داڑھی والے شخص کے ساتھ ایک جوان خاتون بھی تھی جس کی آنکھیں بے چین سی تھیں میرے وجود میں سگنل وصول ہونے لگے میں آگے بڑھا تو اس شخص نے میرا نام پوچھا اور میرا نام سن کر مجھ سے لپٹ گیا۔اس کے پورے بدن میں لرزش تھی۔ میرے اندر درد کی لہریں اُٹھ رہی تھیں اس درد نے مجھے یقین دلایا کہ یہی میرے بہنوائی اور بھانجی ہیں۔

''تصویروں کے سہارے پہچاننا کتنا مشکل ہو جاتا ہے۔تم نے آنے میں بہت دیر کر دی'' بہنوائی نے بھرائی ہوئی آواز میں کہا۔

''پاپا کی نظر بہت کمزور ہوگئی ہے۔شوگر بہت بڑھی ہوئی رہتی ہے۔انسولین کے انجکشن لگتے ہیں''۔میری بھانجی نے کار ڈرائیور کرتے ہوئے بتایا۔''آپ کی آمد کی اطلاع ملی تو بے چین ہوگئے کئی راتوں سے ٹھیک سے سوئے بھی نہیں۔آج بہت سویرے سے تیاری کررہے ہیں۔ہم وقت سے بہت پہلے ایرپورٹ پہنچ گئے''۔ بھانجی نے ہنستے ہوئے کہا لیکن بہنوائی کی آنکھوں سے آنسو بہہ رہے تھے۔میں اس چہرے سے تہیں ہٹانے کی کوشش کرنے لگا جس کے نیچے میرے تصور والا چہرہ چھپا تھا۔ پتہ نہیں وہ چہرہ کہاں کھوگیا تھا۔اس چہرے پر بہتے آنسوؤں نے میرے وجود کے اندر لگے ہوئے Rewind کے بٹن کو دبادیا۔کئی منظر تیزی سے پیچھے کی طرف دوڑنے لگے۔ آنسوؤں سے تر چہرے پر منظر رُکا۔اس چہرے پر شدید بے بسی تھی۔ٹرین کے ڈبے سے جھانکتا ہوا وہ چہرہ میری بہن کا تھا۔ٹرین پٹریوں پر رینگتی چلی گئی۔پھر ایک نقطہ بن کر فضاء میں کھوگئی۔میں نے اپنی بہن کو پھر نہیں دیکھا۔

''تمھارا بھائی آیا ہے'' میرے بہنوائی ایک قبر سے مخاطب تھے۔

میرے سامنے ایک قبر تھی۔قبر کے کتبے پر میری بہن کا نام لکھا تھا۔میری بھانجی مجھ سے لپٹ کر رونے لگی۔ بہنوائی بھی لپٹ گئے۔بس انھیں لمحوں میں وہ کھوئے ہوئے چہرے مجھے مل گئے۔میں خاموشی سے آنسو بہاتا رہا۔

گھر پہنچے تو بچے بے چین تھے۔قمیص شلوار پہنے نوجوان،قدرے توند نکلی ہوئی،سر پر نسبتاً کم بال۔

''تمھارا ماموں'' میرے بہنوائی نے مجھے پیش کیا۔بچوں کی آنکھوں میں حیرت تھی

''اور تمھارے نانا'' بھانجی نے اپنے بچوں سے کہا۔

''دھت نانا ایسے تھوڑے ہی ہوتے ہیں'' چھوٹے لڑکے نے کہا۔سب ہنس دیئے۔ ماحول کا تناؤ ٹوٹا۔ بھانجی کا شوہر بھی آگیا۔بہنوائی نے مجھ سے ایک ایک رشتہ دار کے بارے میں

پوچھنے لگے۔

''ہماری جب شادی ہوئی تھی۔تمھارا یہ ماموں بہت چھوٹا تھا۔ میں اسے گود میں اُٹھائے بازار میں گھومنے جاتا۔کوئی راستہ چلنے والا اس کے گال چھولیتا تو میں ان لوگوں کوڈانٹ دیتا۔ بہت خوبصورت تھا یہ''۔ بچے ہنسنے لگے۔میں جھینپ گیا۔

میرا بستر بہنوائی کے کمرے میں لگادیا گیا۔

میرے بہنوائی کے وجود میں جذبات کا ایک سمندر ٹھاٹھیں ماررہا تھا۔تیس برس سے رُکا ہوا طوفان تھا۔جو کنارے توڑ کر دور تک پھیلنے کے لئے بے چین تھا۔

''ہم یہاں آنا ہی نہیں چاہتے تھے۔تمھارے ابّا نے ہمیں زبردستی بھیج دیا تھا''۔ پتہ نہیں کتنے برسوں سے یہ شکایت ان پر بوجھ بنی ہوئی تھی۔وہ بوجھ سے آزاد ہوگئے۔

''ہم اس زمین کے ہو ہی نہیں سکے۔ مجھے ذرا سا بھی سہارا مل جاتا تو کبھی نہ آتا'' وہ اور بھی کچھ کہہ رہے تھے لیکن میں بڑی تیزی سے پیچھے کی طرف جارہا تھا۔

اب میں چھوٹا سا سات برس کا لڑکا ہوں۔گھر کا عجیب سا ماحول ہے۔امّی کی آنکھیں سرخ رہتی ہیں۔ابّا بھی چپ چپ رہتے ہیں۔اس فضاء نے ہمیں سہادیا تھا۔بہن کا سامان باندھ دیا گیا۔ابّا اور ماموں بھی تیار ہیں۔بہن امّی سے الگ ہی نہیں ہورہی تھیں۔ابّا بار بار کہہ رہے تھے ''اب چلو بیٹا۔ٹرین کا وقت ہورہا ہے''۔ لہجے میں غصہ نہیں بے بسی تھی۔میری ننھی سی بھانجی میری کسی بہن کی گود میں دبکی بیٹھی ہے۔بہنوائی کا چہرہ سخت پتھر جیسا ہے۔ماموں نے بڑی مشکل سے بہن کو الگ کیا۔انھیں رکشا پر سوار کردیا۔اور دوسری بہنیں دروازے تک آکر رک گئیں۔ایک کہرام اُٹھا۔جیسے گھر سے میت جارہی ہو۔ہم اپنی بہن کو اسی روز رو لئے۔ابا اور ماموں دوسرے رکشا میں بیٹھ گئے۔ماموں نے مجھے بھی گود میں بٹھا لیا۔ٹرین آگئی بہن ٹرین میں سوار ہونے کے لئے تیار نہیں ہورہی تھیں ماموں نے بہن کو ٹرین میں سوار کروایا۔''تم لوگ پہنچو، میں بھی تمھارے پیچھے

آ رہا ہوں''۔ ماموں کہہ رہے تھے۔ ماموں بھی بے روزگار تھے۔

''ہاں۔ ہم سب وہاں آ جائیں گے بیٹا'' ابا نے بھرائی ہوئی آواز میں کہا۔

ٹرین نے سیٹی دی تو بہن نے اچانک مجھے بھینچ لیا اور بے تحاشہ پیار کرنے لگیں۔ میرے اندر کچھ پگھلنے لگا اور میں چیخ چیخ کر رونے لگا۔ ٹرین چلنے لگی تو ماموں نے مجھے ان کی گود سے لے لیا۔ وہ چہرہ، وہ چہرہ، میں اسے بھول ہی نہیں سکا۔ پورے دھندلے منظر میں وہ ایک ہی چہرہ فوکس میں تھا۔ شارپ!! پھر سب کچھ آؤٹ آف فوکس ہو گیا۔

''تم نہیں جانتے غیر قانونی طریقے سے سرحد پار کرنا کتنا مشکل کام تھا۔ اس سرزمین پر پہنچے تو ملازمت تیار تھی۔ گھر بھی الاٹ ہو گیا۔ نہ ماموں آئے نہ تم لوگ!!''

ابّا صبح واکنگ کے بعد لوٹے تو سینے میں درد کی شکایت کی۔ دواخانہ میں شریک ہوئے۔ دو روز بعد لوگ ایمبولنس میں ابا کا بے جان جسم لے آئے۔ تین بہنیں ان بیاہی اور میں؟ جس نے دروازے پر پہلے دستک دی امّی نے بہنوں کو بیاہ دیا۔ یہاں آنے کے لئے حالات سازگار ہوئے تو بتیس برس گزر گئے تھے۔

''جب تمھارے ابا کا انتقال ہوا تھا۔ تمھاری بہن تڑپ کر رہ گئیں۔ تمھاری بہنوں کی شادیاں ہوئیں۔ وہ ترستی رہیں کہ کوئی انھیں لینے کے لئے آئے۔ کاش تم ہی آ جاتے۔ وہاں دوبارہ جانے کی حسرت میں وہ چلی گئیں''۔

ان کی آنکھیں بھر آئیں۔

ایک سناٹا سا چھا گیا۔ مجھے ایک جرم کا سا احساس ہوا۔ لیکن ہم دونوں ہی اچھی طرح جانتے تھے کہ کون کتنا مجبور تھا۔

''چھوڑو'' مجھے اُداس دیکھ کر اُنھوں نے کہا ''تم آئے ہو تو ساری باتیں یاد آ گئیں'' ایک عجیب سے خالی پن اور بے معنویت کا احساس جاگا۔

دن بھر ہم شہر کے خوبصورت مقامات دیکھتے لوگوں سے ملتے ، بچوں کو اپنے اس شہر پر بڑا فخر تھا۔ سمندر کے کنارے بسا یہ شہر تھا بھی خوبصورت ! رات ہوتے ہی بہنوائی میرا ہاتھ پکڑ کر ماضی کے اس شہر میں لے چلتے جو ایک ایسی ریاست کا دارالخلافہ تھا جس کا رقبہ اٹلی کے برابر تھا جس کی آب و ہوا ، بحیرۂ روم جیسی تھی ۔ پہاڑیوں سے گھرا باغوں اور جھیلوں کا شہر جس کی بنیاد محبت کی یادگار تھی جس کی ہواؤں میں مستی تھی ۔اتنی مستی کے آدمی پر نشہ طاری رہتا۔مخصوص بولی مخصوص تہذیب ان کا اپنا بادشاہ تھا جس کو اعلیٰ حضرت ، حضور ، فاتح دوراں ، نوشیروانِ زماں ، امیر المومنین ، خلیفۃ المسلمین ، حکیم السیاست ، سلطان العلوم ، سلطان ابن سلطان ، خاقان ابن خاقان کے القاب سے بلاتے اس پر جان چھڑکتے ۔ان کی اپنی جامعہ ، اپنی ریل ، اپنا سکہ ، اپنا ٹپہ ، اپنی فیکٹریاں ، لوہے ، کوئیلے اور سونے کی کانیں تھیں ۔سمنٹ کی پختہ سڑکیں ، خوبصورت عمارتیں تھیں ۔ دور دور سے تاجر یہاں آکر آباد ہوگئے تھے ۔اہل علم کی قدر افزائی ہوتی تھی ۔ ملازمتوں کے حصول کے لئے لوگ آتے تو یہیں کے ہو کر رہ جاتے ۔اس شہر کا سینہ بے حد فراخ تھا۔اس شہر سے نکل کر میں نے اپنے بہنوائی سے پوچھا کہ ’’ پھر وہ شہر گم کیسے ہوگیا ‘‘ اتنا وقت گزر جانے کے اب سب کچھ صاف صاف نظر آرہا ہے۔ وقت کو پہچاننے میں غلطی ہوئی تھی ۔اس رہنما کے سر میں ایک ہی سودا سوار تھا کہ اس مملکت کو آزاد رہنا ہے۔ پھر تو انتہا پسند انقلابی لیڈر کی آواز بادشاہ کی آواز سے اونچی ہوگئی۔ لوگ اس کے اشاروں پر ناچنے لگے۔ سیاست کی جگہ جذبات نے لے لی۔ حکمت کی جگہ جوشیلی تقریریں آگئیں۔ سیاسی لڑائی کو مذہبی رنگ دیا گیا۔ نیم فوجی دستے بنے۔ نوجوانوں کو خدا ، مذہب اور قرآن کے نام پر قربانی کے لیے تیار کیا گیا۔ ریڈیو سے حب الوطنی کے گیت بجائے جانے لگے۔ جب وقت آیا تو نیم فوجی دستے لڑنے نکلے۔ شاہ کے نام کے نعرے بلند ہوئے۔ جیالے نوجوان ٹینکروں کے سامنے لیٹ گئے۔ بادشاہ کا فوجی کمانڈر اپنی فوج کے ساتھ تماشہ دیکھتا رہا۔ دیکھتے ہی دیکھتے تیس ہزار لاشوں کو عبور کر کے وہ لوگ آگئے ۔ایک شرم ناک شکست ! سب ختم ہوگیا۔ بلند بانگ

دعوؤں کے ردعمل کے خوف سے ماں باپ نے اپنی بیٹیوں کو کنویں میں چھلانگ لگانے اور زہر کھانے پر مجبور کردیا۔فوجی کمانڈر نے آگے بڑھ کر فاتحین کا استقبال کیا۔قربانیاں رائیگاں گئیں۔ بادشاہِ وقت نے انھیں غدار قرار دیا، آزاد مملکت کا خواب چکنا چور ہوگیا۔خوف و ہراس کے اس ماحول میں ترکی ٹوپیاں چھپادی گئیں۔بعض افراد نے گھبرا کر گاندھی کیپ اوڑھ لی۔ جسے ایک مضبوط قلعہ سمجھا جارہا تھا، وہ ہوا کے ایک ہی جھونکے میں زمین بوس ہوگیا۔ پرندے گرے ہوئے درختوں پر بسیرا نہیں کرتے وہ سب پھڑ پھڑا کر ایک سمت بھاگے۔اس بھاگ دوڑ کے بعد طوفان تھما تو پتہ چلا نہ اینٹوں کی بھٹی ہے، نہ ریت ہے، نہ سمنٹ کے بورے نہ ٹرکس ہیں اور نہ مزدور، ایک چٹیل میدان تھا جہاں بیروزگاری کا بھوت منہ کھولے کھڑا تھا۔دوبارہ ٹھیکے داری کا سوال ہی نہ تھا۔ تینوں سمتوں میں اندھیرا تھا۔ہمیں بھی اسی سمت ڈھکیل دیا گیا۔میں سوچتا ہوں مجھے تھوڑا اور وقت مل جاتا تو یہاں کبھی نہ آتا۔ دیکھو تم تو اپنی زمین سے جڑے ہوئے ہونا۔ہجرت کا کرب تو نہیں سہا۔ہجرت وہی اچھی لگتی ہے جب فاتح دبے پاؤں اپنی زمینوں پر واپس آئیں۔"

میں چپ رہا۔ہم نے تو اپنے ہی شہروں میں ہجرت کا کرب سہہ لیا۔وہ تہذیب سمٹ کر چند محلوں میں رہ گئی۔فصیل بند شہر کے دروازوں اور دیواروں کو توڑ کر شہر دور تک پھیل گیا۔سرخ مٹی کو سیاہ مٹی سے جدا کر دیا گیا۔غذائیں بدل گئیں لباس بدل گئے۔سڑکوں اور گلیوں کے اجنبی نام رکھ دیئے گئے۔ وہ جھیل جو کسی بزرگ کے نام سے موسوم ہے وہاں ایک بُت نصب ہے۔ وہاں مورتیاں ڈبوئی جاتی ہیں۔ وہ پہاڑ جہاں نوبت بجائی جاتی تھی وہاں مندر کی گھنٹیاں بجتی ہیں۔ لوگوں کا ایک ریلا یہاں آکر بس گیا۔اُنھوں نے اپنی اپنی بستیاں اس شان سے بسالیں کہ ہم سمٹ کر گندہ بستیوں میں آگئے ہیں۔شہر کا بدنما حصہ جسے کوئی نہیں پوچھتا۔نئی نئی عمارتیں زمین کے سینے میں پیوست کی جارہی ہیں۔ اب شہر کی انفرادیت باقی نہیں رہی۔ دوسرے شہروں جیسا ہوگیا۔ سڑکیں دیواروں اور صحنوں میں اتر آئی ہیں۔شہر خوبصورت ہوگیا ہے لیکن عام شہروں جیسا ہوگیا ہے

سمنٹ کا جنگل۔شاہ کا نام بعض عمارتوں نے باقی رکھا ہے اور بس! اب فسادات کم ہوتے ہیں لیکن ہمیں خوف، ہراس اور احساسِ کمتری میں مبتلا کردیا گیا ہے، ساری قوم کی پیشانی پر دہشت گردی کا نشان داغ دیا گیا ہے۔تمھاری زمین کا سایہ ہمارے سروں پر منڈلاتا رہتا ہے۔لیکن میں نے کچھ نہیں کہا۔

''ہاں ہمیں تحریر وتقریر کی آزادی ہے۔لاوڈ اسپیکر پر اذانیں بھی گونجتی ہیں''۔ میں نے کہا ''یہاں گولیاں بہت چلتی ہیں۔جن تیس ہزار لاشوں کو ہم نے ایک بڑا حادثہ سمجھا تھا وہ کچھ بھی نہیں ہے۔ یہاں تو لاشوں کا ایک لامتناہی سلسلہ ہے۔نوجوان آسائشوں کی تلاش میں دور دور تک چلے گئے ہیں۔سینکڑوں میل دور بیٹھے وہ اپنے وطن میں موجود ماں باپ کی سلامتی کی دعائیں مانگتے ہیں۔عورتیں کچھ تو اپنے شوہروں کے پاس چلی گئیں اور جو یہاں رہ گئیں وہ رات رات بھر ٹی وی کے سامنے بیٹھتی ہیں اور صبح دیر سے جاگتی ہیں۔مرغن غذائیں کھا کھا کر موٹی ہوتی جارہی ہیں پھر جم (Gym) چلی جاتی ہیں۔ پتہ نہیں یہ سب کیا ہورہا ہے۔'' بہنوائی نے کہا میرے پاس اس کا کوئی جواب نہیں تھا۔

بچے بہت جلد گھل مل گئے۔انھیں اپنی زمین کی برتری جتانے کا شوق تھا۔جس کرب سے میرے بہنوائی گزر رہے تھے بچے اس کا شکار نہیں ہوئے تھے۔انھیں اپنی تہذیب اور کلچر پر فخر تھا۔ بزرگ انھیں ماضی کا مسخ شدہ چہرہ سونپنے کی کوشش میں ہانپ رہے تھے۔نوجوانوں میں ایک جوش تھا ایک جذباتیت تھی۔ وہی جذباتیت جو زمین کے ٹکڑے کردیتی ہے۔وہ بربریت کے خوفناک منظر میں جی رہے تھے۔موقع ملتے ہی دولت کی تلاش میں نکل پڑتے۔

ویزا ختم ہوگیا۔ میں نے توسیع نہیں لی۔ میرا وجود بہنوائی کو حکومت کی آنکھوں میں مشتبہ بنا سکتا ہے۔ میں نے یہی محسوس کیا۔فضا صاف نہیں تھی۔ جانے کا وقت آگیا اس بار بچے بھی لپٹ کر روئے۔ بہنوائی نے وعدہ کیا کہ مرنے سے قبل وہ ایک بار سارے بچوں کے ساتھ آئیں گے۔

تمام رشتہ داروں سے ملوائیں گے۔

ایر پورٹ جاتے ہوئے قبرستان پر پھر کار رُکی۔ ہم بہن کی قبر کے پاس پہنچے۔ بہنوائی نے کہا۔ ’’دیکھو تمھارا بھائی جارہا ہے‘‘ ان کی آنکھوں سے آنسو بہہ رہے تھے۔ میں بھی قبر سے لپٹ گیا۔

پلین اپنی رفتار سے چل رہا تھا۔ لیکن میں اب بھی وہیں تھا۔ میرے وجود میں قبر کی مٹی کی خوش بو بس گئی تھی۔ پتہ نہیں پھر کب ملاقات ہو۔

خوبصورت شہر کی اونچی عمارتوں نے احساس دلایا کہ میں اپنی زمین پر واپس آ گیا ہوں۔ ایر پورٹ سے ہوٹل آیا۔ بہنوائی کو فون لگایا کہ بخیر و خوبی پہنچنے کی اطلاع دوں۔ بہنوائی نے فون اُٹھایا۔ میں نے پہنچنے کی اطلاع دی۔ اُنھوں نے بھرائی آواز میں کہا ’’ایر پورٹ سے واپسی پر ہم پھر قبرستان گئے۔ دل بھر آیا تھا۔ تمھاری بہن کی قبر سے لپٹ کر رونا چاہتا تھا، لیکن سنو، تم سن رہے ہو نا؟ تمھاری بہن کی قبر کا کہیں پتہ نہیں چلا۔ ہم نے قبرستان کا چپہ چپہ چھان مارا۔ تمھاری بہن کی قبر کہیں دکھائی نہیں دی۔‘‘

میں سناٹے میں آ گیا۔ تو کیا میرے ساتھ میری بہن کی مٹی بھی آ گئی؟

☆☆☆

سانسوں کے درمیان

وہ عجیب سی ذہنی حالت میں جی رہا تھا۔

ایسی حالت جس میں وہ معمول کے مطابق ہر عمل کر رہا تھا لیکن وہ عمل اس کی یادداشت کا حصہ نہیں بن رہا تھا۔ خواب خواب کیفیت، جیسے بہت زیادہ نشے میں ہو سب کچھ یاد رہتا ہے لیکن کہیں کہیں درمیانی کڑیاں غائب ہو جاتی ہیں۔ سب کچھ نظر آتا ہے لیکن دھندلا دھندلا...... وہ گفتگو بھی کرتا تھا۔ جواب بھی سنتا تھا لیکن الفاظ گہرے کنویں میں گرتے جاتے اور آواز اندر سے آتی مبہم مبہم سی...... وہ چلتا تھا لیکن جیسے زمین سے دو اِنچ اوپر چل رہا ہو......

وہ آفس میں بیٹھا کسی اہم فائیل سے جھونجھ رہا تھا۔ سپرنٹنڈنٹ نے بتایا کہ اس کا فون ہے۔ اس فون کو سننے کے بعد وہ اس کیفیت میں پہنچ گیا تھا ایک عجیب سے زون میں!

دو باتیں پورے حواس پر غالب تھیں۔

ابا پر دورہ پڑا ہے۔ وہ شہر کے سب سے بڑے سوپر اسپیشالیٹی ہاسپٹل کے ICU میں ہیں۔

وہ ہسپتال پہنچا۔ دھندلے دھندلے چہرے، جانی پہچانی آوازیں، تسلیاں، دلاسے، وارڈ بوائز، نرسیں، لفٹ...... آئی سی یو کا دروازہ، دربان، ابا کی بند آنکھیں۔ ناک میں نلیاں، آکسیجن، ماسک، گلوکوز، ڈسپوزیبل انجکشن، گلاوزلیس، ای سی جی کے مشین کے اسکرین پر دوڑتی ہوئی تیڑھی میڑھی لکیریں۔ نبض کی رفتار بتانے والے ڈوبتے اُبھرتے ہندسے...... پھر ماضی کی مٹی مٹی سے تصویریں...... ہر تصویر ابا کے کلوز اپ پر ختم ہوتی۔ کلوز اپ بڑھتے بڑھتے صرف آنکھیں رہ جاتیں، بند آنکھیں......!!

پھر ابا نے آنکھیں کھولیں اور آنکھوں نے اسے پہچانا بھی۔ آنکھیں کھلتے ہی منظر واضح ہونے لگا۔ الفاظ کنویں سے باہر آئے۔ آوازیں صاف سنائی دینے لگیں، ابہام کی تہیں کھلیں۔ لفظوں سے جملے بنے...... اس کے پیر زمین سے لگے۔ پیروں کے نیچے بڑا خوب صورت فرش تھا۔ ٹھنڈا......!! اب سب کچھ فوکس میں تھا...... وہ کمرہ بہت خوب صورت تھا خوب صورت بیڈ تھا۔ جس پر ابا لیٹے تھے۔ سفید چادر، نرم تکیے، ابا کا وجود اب بھی نلکیوں سے جڑا ہوا تھا، آنکھیں بند تھیں۔ ایک طرف ایک خوب صورت تخت بچھا ہوا تھا۔ ایک گوشے میں ٹی وی رکھا تھا۔ ایک بالکنی جیسا حصہ تھا جس میں بید کی کرسیاں رکھی ہوئی تھیں۔ شیشے کی ٹیبل پر تازہ پھولوں بھرا گلدستہ...... شان دار پردے، ایر کنڈیشنر، اٹیچڈ باتھ روم، شاور، گیزر، ٹائلز......! اس پورے کمرے میں اگر کوئی شے بے تکی تھی اور کمرے کے ساز و سامان کے ساتھ میل نہیں کھا رہی تھی تو وہ ان دونوں کے وجود تھے۔ وہ اور اس کی بیوی!! معمولی سے میلے کچیلے کپڑے، پرانی سستی گھسی ہوئی چپلیں...... اُلجھے ہوئے بال، ستے ہوئے چہرے۔ اس نے کمرے کو دیکھا۔

''ہم یہاں کیسے آ گئے......'' اس نے بیوی سے پوچھا۔

''ICU سے بابا کو یہاں منتقل کیا گیا، پیئنگ روم میں''۔ اس کی بیوی نے حیرت سے کہا۔

''پیئنگ روم میں!''

اس کا ہاتھ بے اختیار اپنی جیب کی طرف گیا۔کافی اچھی رقم جیب میں موجود تھی۔
دھند چھٹ گئی تو کئی چہرے واضح ہوئے ، اس کی بہن کا چہرہ ، بھانجے کا چہرہ ، دوست کا چہرہ...... چھوٹے بھائی کا چہرہ جو ریاض میں رہتا ہے...... ٹیلی فون ، دستک ، ہنڈی والا......نوٹوں کے بنڈل ......تب ہی تو سوپر اسپیشالیٹی ہاسپٹل ، ICU اور ابا نے آنکھیں کھولیں ......اس کے پیر بھی زمین سے لگے ورنہ......؟

اس نے کمرے میں لگے آئینے میں خود کو دیکھا...... وہ تو یہاں کے تیسرے درجے کے ملازم سے بھی بدتر لگ رہا تھا۔اسے بڑی شرم محسوس ہوئی ......اب تو ابا خطرے سے باہر آ گئے ہیں۔ اپنی بیوی سے کچھ کہے بغیر وہ نیچے گیا۔پہلی بار اس نے ہسپتال کی لابی کو غور سے دیکھا۔حالانکہ وہ ان تین دنوں میں کتنی بار یہاں سے گزرا تھا۔لیکن اس کا وجود زمین سے دو انچ اوپر تھا...... کیا شان دار ہال تھا۔چھت سے لٹکا ہوا خوبصورت شینڈ لیر ، چکنا فرش ......صوفے ......خوب صورت لڑکیاں اور خوب رولڑ کے مختلف کاؤنٹرس پر بیٹھے تھے بالکل کسی فائیو اسٹار ہوٹل کی طرح ......وہ باہر نکل آیا۔شیو بنوایا...... کچھ ڈھنگ کے کپڑے ضروری ہیں ...... کتنا بُرا لگ رہا ہے، وہ ہسپتال وہ کمرہ......اپنے لیے ایک کرتا پاجامہ خریدنے کے لیے دکان میں گھسا تو ایک اچھی سی شرٹ اور پینٹ بھی دکاندار نے پیاک کر دیئے۔ایک اچھی سی چپل خریدی۔ بیوی کی چپلیں بھی گھس گئی تھیں اس کے لیے بھی چپل خریدی۔ایک اچھی سی میکسی اس کا بھی بھرم رکھ سکتی ہے۔یہ سب کر کے وہ جلد ہی واپس آ گیا۔ پتہ نہیں کب اس کی ضرورت پڑ جائے۔ابا سکون سے سو رہے تھے۔ پہلے وہ نہانا چاہتا تھا۔ باتھ روم دیکھ کر اسے گدگدی سی ہونے لگی۔اس نے گیزر آن کیا۔پہلی بار اسنے خود کو آئینے میں بے لباس دیکھا تھا۔زمین پر بھیجا ہوا آدم ،شاور کھولا۔نیم گرم پانی کی بوندیں ایک بے آواز آہنگ پیدا کر رہی تھیں۔اوپر تک یہ آہنگ پہنچا۔ایک تصویر بنی۔ پتہ نہیں کب سے یہ لاشعور میں آ کر چھپ گئی تھی کوئی میگزین ،کوئی فلم کا منظر......ایک مرد اور ایک عورت شاور کے نیچے بے لباس نہا رہے تھے۔اسی

دھندلی سی کیفیت میں اس نے کمرے میں موجود عورت کو آواز دی۔ بڑے پس و پیش کے بعد وہ تصویر بن پائی۔ شاور کی پھوار کے نیچے دو بے لباس بدن ......اس عورت کے بدن میں کتنا کساؤ ہے۔ وہ کسی کی موجودگی کا خوف بھی دلا رہی تھی۔ مزاحمت بھی کر رہی تھی اس کی بیوی تو ایک دم سرینڈر ہو جایا کرتی ہے۔ اس پر وہی کیفیت طاری ہونے لگی۔ وہ اس زون میں پہنچ گیا۔ لفظ کنویں میں گرتے جا رہے تھے۔ سرگوشیاں گونج میں تبدیل ہو رہی تھیں۔ اس کا وجود زمین سے اوپر اُٹھ گیا تھا۔ اس دھندلی فضا میں ایک عورت کا بدن تھا، صرف بدن ......اسی کیفیت میں بھیگے جسموں کے ساتھ وہ تخت پر گر گئے ......طوفان تھما تو پیر زمین سے لگے۔ اس نے اپنی بیوی کو چادر سے ڈھک دیا خود باتھ روم میں گھس گیا۔ آہستہ آہستہ اپنی دنیا میں لوٹنے لگا۔ اسے احساس ہوا کہ لوگ ہنی مون کیوں مناتے ہیں۔ کتنے عرصے بعد آج وہ ایک حقیقت تک پہنچا تھا۔ کتنے راز عیاں ہوئے تھے۔ کتنے زاویوں سے باخبر ہوا تھا۔ کتنی پرتیں اس نے ہٹائی تھیں۔ یہ لمحے اس کی زندگی میں نہ آتے تو اس کا اپنا سب کچھ اس چھوٹے سے کمرے کی تاریکی میں دفن ہو کر رہ جاتا۔ اچھا ہوا کہ اس پورے عمل میں ابّا بیدار نہیں ہوئے۔ وہ خوف سے کانپ گیا۔ نہا کر اس نے نیا کرتا پاجامہ پہنا ابّا کے پاس جا کر بیٹھ گیا۔ وہ سکون سے سو رہے تھے ......مشین پر بنتی لکیروں کی لہروں میں تناسب تھا۔ وہ خود کو ہلکا پھلکا محسوس کرنے لگا۔ ایک نئی قسم کی سرشاری تھی۔ اس کی بیوی بھی نہا کر آ گئی۔ نئی میکسی پر بہت جچ رہی تھی۔ اس نے بیوی کو قریب بلایا۔ ایک ہلکا سا بوسہ!!

''اگر ابّا کی آنکھ کھل جاتی تو؟'' اس کی بیوی نے شرماتے ہوئے کہا۔

وہ ہنسنے لگا...... ''آپ پر تو جیسے کوئی بھوت سوار ہو گیا تھا''۔ اس کی بیوی نے شکایت بھرے لہجے میں کہا۔

''تم بیٹھو یہاں میں چائے کے لیے کہہ آتا ہوں......''

اس نے باہر نکل کر انچارج نرس سے پوچھا۔ اس نے کہا کہ وہ فون پر کینٹین کا نمبر ملا کر

آرڈر کردے۔اس نے یہی کیا...... پوراٹی پاٹ آ گیا۔ڈ کاکشن، دودھ، چینی ......اس نے دو پیالی چائے پی ......تھوڑی دیر بعد بیرہ بل لے آیا۔اس نے پیسہ دینا چاہا تو بیرے نے کہا وہ صرف سائین کردے حساب بعد میں ہوگا......

شام ہورہی تھی، وزیٹرس ٹائم شروع ہونے والا تھا۔اس نے اپنی بیوی سے کہا کہ اس سے قبل کہ بچے یہاں آجائیں وہ گھر جائے گا۔بچوں کا حلیہ درست کرنا ضروری تھا......وہ بچوں کو بازار لے گیا۔صرف عیدوں کے موقع پر یا خاندان میں کوئی اہم شادی ہو تو وہ کپڑے خریدتے تھے۔ بچوں کو حیرت ہوئی۔ایک اچھی سی ریڈی میڈ کپڑوں کی دکان پہنچ کر اس نے بچوں سے کہا کہ وہ اپنے لیے کپڑے پسند کریں۔اس کی بیٹی نے جھجکتے ہوئے کہا وہ جینس اور ٹی شرٹ خریدے گی۔کیا ہرج ہے اس نے سوچا کالج کی سبھی لڑکیاں پہنتی ہیں۔ٹی شرٹ اگر لمبی ہو تو دائرے اور زاویے بھی نہیں بن پاتے۔اس نے منع نہیں کیا ......لڑکے نے بھی دو اچھے جوڑے پسند کیے۔ڈھنگ کے جوتے خریدے۔بیٹی نے لڑکیوں کی اور کئی چھوٹی موٹی چیزیں خریدیں، وہ بے نیازی سے بل ادا کرتا رہا۔قریبی بیکری میں بچوں کو پزا کھلایا خود برگر پر اکتفا کیا، کول ڈرنک ...... ! بچے کتنے خوش تھے۔

جب وہ دواخانہ آیا تو بیوی نے بتایا سبھی آئے تھے وقت ختم ہونے تک بیٹھے رہے ڈاکٹر بھی راؤنڈ پر آیا تھا۔

''کتنے دن رہنا پڑے گا؟''

''دو تین دن لگ جائیں گے'' بیوی نے کہا اس نے اطمینان کی سانس لی......

بیوی نے بتایا کہ وزیٹنگ آور میں کیا خوبصورت اور اونچے گھرانوں کے لوگ آتے ہیں......پھلوں کی ٹوکریاں اور بکے لیے ہوئے......

رات دیر گئے تک وہ ٹی وی دیکھتا رہا۔آواز اس نے بالکل کم کردی تھی۔زندگی میں کبھی

فرصت ہی نہیں ملی کہ چین سے ٹی وی دیکھتا۔کیا کیا چیانلس تھے، کیا قیامتیں تھیں ...... بار بار اس کا وجود زمین سے اوپر اُٹھنے لگتا۔ یہ مغربی لڑکیاں، اخروٹی بال، درازقد، متناسب الاعضاء ......جسم دکھانے کے فن سے واقف، میوزک چیانل، فیشن چیانل ...... کمرے میں موجود عورت اس کے شانے پر سر ٹکائے اس کے ساتھ بیٹھی تھی ...... بہت رات ہونے کے بعد وہ سوئے ......رات بھر وہ ان حسیناؤں کو اس عورت میں تلاش کرتا رہا۔

صبح دستک پر جاگا۔اس نے بیوی کا بدن چادر سے ڈھانک دیا۔نرس تھی۔نرس نے ٹمپریچر لیا۔ بلڈ پریشر چیک کیا۔ پھر صفائی کرنے والے آئے ...... ہاؤز کیپنگ والے آئے۔ چادریں بدل دی گئیں ......دونوں نہا کر تیار ہوگئے۔ابا بھی آنکھیں کھولے بیٹھے تھے۔بات ابھی بھی نہیں کر رہے تھے۔اس نے ناشتے کا آرڈر دیا۔ڈاکٹر بھی راؤنڈ پر آیا۔اس نے دفتری انگلش میں ابا کی حالت پوچھی۔تشویش کی کوئی بات نہیں تھی سب کچھ ٹھیک ٹھاک تھا۔ڈاکٹر نے بتایا کہ دو تین دن تو ابزرویشن میں رکھنا ضروری ہے۔ڈاکٹر کے جانے کے بعد بیوی نے کہا کچھ پیسے چاہیے۔

''کیوں؟''

''بیوٹی پارلر جاؤں گی''۔

''کیوں؟''

''بال بنواؤں گی ......اس لمبی ڈاکٹر کی طرح ......آئی بروز بھی بنوانا ہے۔ مینی کیور، پیڈی کیور......

''اس کی کیا ضرورت ہے؟''

''یہاں رہنے تک تو بھرم رکھنا ہوگا نا؟''

وہ چپ ہوگیا۔اس کی بیوی نے پیسوں کے بنڈل سے کتنے نوٹ نکالے اس نے دیکھنا مناسب ہی نہیں سمجھا...... بیوی پیسہ لے کر چلی گئی۔

وہ اپنے والد کے قریب بیٹھ گیا۔ وہ اسے آنکھیں کھولے ایک ٹک دیکھنے لگے۔ کچھ کہا بھی لیکن اسے سمجھ میں نہیں آیا......وہ ہولے ہولے سر دبانے لگا۔

وزیٹرس کا وقت شروع ہوا تو سب سے پہلے اس کے بچے آئے۔

''ڈیڈی......'' لڑکی نے خوشی سے آواز دی......وہ نظر بھر کر دیکھ نہیں پایا۔ اسٹریچ پائنٹ اور ٹی شرٹ میں سے کتنے چھپے ہوئے راز عیاں ہو رہے تھے۔

''کیسی لگ رہی ہوں'' بیٹی نے قریب آکر پوچھا اور اس سے لپٹ گئی تو وہ جھجک گیا۔

''ہاؤ اِز گرینڈ پا......''

''ٹھیک ہیں بیٹا سو رہے ہیں''۔

لڑکا بھی بہت اسمارٹ لگ رہا تھا۔ اس کی دل چسپی باہر کھڑی نرس میں زیادہ تھی۔

''بیٹھو......''

اس نے فون کر کے کچھ چکن پیٹیز اور کول ڈرنکس کا آرڈر دیا۔ اس کی بہنیں اور بھانجے بھانجیاں بھی آگئیں۔ اس نے چکن پٹینز کی تعداد بڑھا دی، کول ڈرنکس کی جگہ چائے کا آرڈر دیا۔ سب ہاسپٹل کے ڈسپلن اور انتظامات کے بارے میں باتیں کرنے لگے۔ چکن پٹیز بھی سب کو پسند آئیں، پھوپھیوں نے دونوں بچوں کو پیار کیا۔

''ہائے بنٹی کتنی پیاری لگ رہی ہے'' سب کے لہجے بدل گئے تھے۔ سب کتنے مہذب لگ رہے تھے۔

''کوثر کہاں ہے'' اس کی بیوی کے بارے میں سوال کیا گیا۔

''گھر گئی ہیں''۔

دیکھتے ہی دیکھتے سارا خاندان جمع ہو گیا۔ اس بار چائے بسکٹ کا دور چلا۔ پورے خاندان میں اس کی بیٹی ہیروئن بنی ہوئی تھی۔ اس کی گفتگو کا انداز ہی بدلا ہوا تھا......وہ کمرہ؟

وقت اتنی جلد ختم ہو جائے گا کسی کو احساس بھی نہیں تھا۔ سب لوٹ گئے وہ اکیلا رہ گیا۔ ابّا نے سب کو آنکھیں کھول کر دیکھا تھا۔ آنکھوں میں کبھی شناسائی چمک جاتی اور کبھی اجنبیت کا اندھیرا چھا جاتا۔ ابھی وہ بات کرنے کے موقف میں نہ تھے......

وہ چپ چاپ بیٹھا رہا۔ دروازے پر دستک ہوئی۔ وہ حیرت زدہ رہ گیا۔ ترشے ہوئے خوب صورت بال ......اسٹارچ دی ہوئی ساری، ناف سے نیچی باندھی ہوئی، چھوٹے سلیوس کا چست بلاؤز......! وہ بالکل اس لمبی ڈاکٹر کی نقل لگ رہی تھی۔

''کیسی لگ رہی ہوں؟''

''بہت خوب صورت'' اس نے بیوی کو لپٹایا۔

دونوں ٹی وی دیکھتے رہے۔ اپنی بیوی کو اتنا خوش اس نے کبھی نہیں دیکھا تھا۔ ماحول!!

گھر میں کھانا بنانا بند کر دیا گیا۔ صبح لڑکا آتا۔ کینٹین میں ناشتہ کرتا۔ گھر کے دوسرے افراد کے لیے پارسل لے جاتا۔ دوپہر ویسے ہی گزار لیتے۔ شام سنیکس اور جاتے ہوئے رات کا کھانا......

وزیٹنگ ہاور میں سارے خاندان کے لوگ بڑی پابندی سے آنے لگے تھے ......بنٹی کی سہلیاں بھی آجاتیں وہ انھیں لے کر کینٹین چلی جاتی۔ کبھی لڑکے کے دوست آجاتے۔ لڑکے کی زیادہ توجہ ایک خاص نرس پر تھی۔ اپنے دوستوں کے ساتھ وہ اسے چھیڑا کرتا۔ وہ اپنے دوست سے موبائیل فون بھی لے آیا تھا۔ وہ کہیں بھی رہے ضرور فون کرتا۔ کبھی بچوں کو دواخانے سے فون کر لیتا۔ بڑی سہولت تھی۔ تین دن میں وہ کئی بار ری چارج کروا چکا تھا۔ شام بڑی اچھی گزرنے لگی تھی ......تمام رشتہ دار لڑکیاں بنٹی کی سہلیاں خوب انجوائے کرتیں۔ جنیفر لوپیز، رکی مارٹن، Briteny Spears، میڈونا اور وینگا بوائز کے نئے گیتوں کی باتیں، ملائکہ، ایشوریا اور امرتا اروڑہ کی باتیں، بڑی عمر کے لوگوں کا موضوع ٹی وی سیریلس ہوتے ......پورے ہسپتال کا اسٹاف دوست

ہو گیا تھا۔ آتے جاتے وقت سبھی سلام کرتے اسے شاید بہت بڑا آفیسر سمجھنے لگے تھے۔

اس کی بیوی نے ایک مکسی گرائینڈر بھی خرید لیا تھا۔ ایک کولر اور اسفنج کا گدا...... کچھ بیڈ شیٹس! ابا لوٹ کر آئیں گے تو ان کے لیے پھلوں کا رس نکالنا ہوگا۔ آرام دہ بستر بھی ضروری ہے۔

ایک ہفتہ گزر گیا۔ ڈاکٹروں نے ابھی جانے کی اجازت نہیں دی۔ کسی بھی وقت دوبارہ دورہ پڑ سکتا ہے۔ پیسہ ختم ہو رہا تھا...... ڈاکٹروں کا کہنا تھا ایک اور ٹسٹ لے کر وہ اطمینان کر لیں گے۔ کم سے کم دو دن تو رکھنا ہی ہوگا۔ کینٹین اور دواؤں کا بل دیکھ کر اس کے پیروں تلے زمین نکل گئی۔

لڑکی کو شکایت تھی کہ اس کی ڈریسنگ ریپیٹ ہو رہی ہے۔ کم از کم دو جوڑے بنائے جائیں۔ بیوی کی ساڑیوں کا اسٹاک ختم ہو رہا تھا......

شام میں تمام رشتہ دار اکٹھا ہوئے تو اس نے مسئلہ چھیڑا۔ سب کو سانپ سونگھ گیا۔ جو پیسہ دے سکتے تھے وہ پہلے دے چکے تھے۔ دوسرے اس جھمیلے میں پڑنا نہیں چاہتے تھے۔ آفس سے جتنے لون مل سکتے تھے وہ پہلے ہی لے چکا تھا۔ ریاض والے بھائی نے ابا کی طبیعت پوچھنے کے لیے روز کی طرح فون کیا تو اس نے سچویشن بتائی۔ اس نے بھی مجبوری کا اظہار کیا۔ اب ایک ہی صورت رہ گئی تھی کہ وہ ابا کو گھر واپس لے جائے۔ سب نے یہی کہا تھا کہ وہ جو مناسب سمجھے کرے...... بڑی بہن چاہتی تھیں کہ ڈاکٹروں کی ہدایت کے مطابق کام ہو......

وہ ڈاکٹر سے ملا۔ ڈاکٹر نے کہا کہ صرف دو دن وہ اور صبر کر لے...... آبزرویشن ختم ہو جائے گا۔ ان ہسپتالوں کے بارے میں اس نے کیا کیا نہیں سن رکھا تھا۔ جب تک ہزاروں کا بل نہیں بن جاتا وہ کسی پر رحم نہیں کرتے۔

کافی بحث کے بعد ڈاکٹر اس بات پر راضی ہوا کہ وہ اپنی ذمہ داری پر مریض کو لے جا سکتا ہے۔ بل کی ادائیگی کے بعد بہت کم بچا تھا۔ گھر پر بھی تو علاج کروانا ہوگا۔

شام میں وزیٹنگ آور میں صرف اس کی بیٹی اور بہن ہی آئیں ۔ایک سناٹا سا تھا۔اس نے بیٹی سے کہا وہ ابّا کے لیے کمرہ درست کردے۔

''ڈیڈی کیا ہم دو دن اور نہیں رہ سکتے؟''

''نہیں بیٹے بہت مشکل ہے۔کہیں سے پیسوں کا انتظام نہیں ہوا''۔

لڑکی بھی اُداس ہوگئی۔اِدھر کچھ دنوں سے وہ خود کو اونچے طبقے کے افراد ہی سمجھنے لگے تھے۔ اس نے بیٹی کے لیے چکن پیٹیز اور چائے منگوائی۔

''ہم کبھی کبھی یہاں سے پیٹیز منگوالیں گے......''اس نے بیٹی کو سمجھایا۔

صبح موٹر کا بھی انتظام کرنا تھا......

لڑکی کے جانے کے بعد اس پر عجیب سی کیفیت طاری ہونے لگی۔ایر کنڈیشنز، ٹی وی، بالکنی میں رکھی بید کی کرسیاں جہاں سے سارا شہر نظر آتا ہے، وہاں بیٹھ کر چائے پینے کا لطف ہی کچھ اور ہے، اٹیچڈ باتھ روم، شاور، گیزر، ٹائلز......

دن بھر کی بھاگ دوڑ کے بعد وہ تھک گیا تھا......وہ نہانے چلا گیا۔ایک دھندلی سی کیفیت، اس نے کمرے میں موجود عورت کو آواز دی۔وہ تصویر جلد بن گئی۔کسی پس وپیش کے بغیر......شاور کے نیچے دو بے لباس بھیگتے بدن، کسی کی موجودگی کا خوف بھی نہیں تھا......لفظ کنویں میں گرتے جا رہے تھے۔سرگوشیاں بازگشت اور گونج میں بدلتی جا رہی تھیں۔اس کا وجود زمین سے اوپر اُٹھنے لگا......دھندلی دھندلی فضا میں سانسیں بڑی تیزی سے چل رہی تھیں......اتنی تیز سانسیں کہ پورا کمرہ گونج رہا تھا۔وہ اس بدن کو سمیٹے تخت پر آیا۔سانسیں......سانسیں......جیسے کانوں کے پردے پھٹ جائیں گے۔

اس کا وجود دھپ سے زمین پر گرا......ابّا کی سانسوں سے پورا کمرہ کانپ رہا تھا، دیواریں لرز رہی تھیں......اس نے جلدی جلدی کپڑے پہنے، پتہ نہیں کب سے وہ بے چین تھے۔پورا جسم

پسینے میں تر تھا۔ آنکھیں چھت کی طرف لگی تھیں ۔ زبردست دورہ پڑا تھا۔ اس نے نرس کو پکارا......
نرس ڈیوٹی ڈاکٹر کو لے آئی ۔ سب کچھ پلک جھپکتے ہوا۔ کچھ وارڈ بوائے بھی آ گئے ۔لیکن جب وہ
بڑے ڈاکٹرس کے ساتھ کمرے میں پہنچا تو سناٹا تھا......سانسوں کا شور ختم ہو چکا تھا۔ ای سی جی
مشین پر بے ترتیب لکیریں......نبض بتانے والے ہندسے......!!

ڈاکٹر نے اس کی طرف مایوسی سے دیکھا...... کچھ کہا بھی لیکن الفاظ کنویں میں گرتے چلے
گئے......اور وہ زمین سے دو اِنچ اوپر اُٹھ گیا۔

نجات

فون پر فرحان کی آواز سن کر میں چونک گیا۔ ابھی پچھلے ماہ وہ گیا تھا۔

تم آگئے کیوں؟ کیا عاشی کے بغیر رہنا مشکل تھا۔

''نہیں یار ایسی بات نہیں ہے۔ شام میں تم ملو تو بتاؤں گا''۔

تم ہی اِدھر جاؤ اور دوستوں سے بھی ملاقات ہو جائے گی۔ اس کا نیا گھر یہاں سے کافی دور تھا......شام وہ گھر آگیا۔

''کیوں واپس آگئے تم......؟''

''وہ انڈر ورلڈ والے پیچھے پڑ گئے تھے۔ تم تو جانتے ہو وہ لوگ کتنے خطرناک ہوتے ہیں''۔

''لیکن انڈر ورلڈ والوں سے تمھارا کیا تعلق؟''

جس کمپنی میں کام کرتا ہوں وہ سارے ایک ہی علاقے کے ملازم ہیں۔ انھیں میری موجودگی کھل رہی تھی۔ ممکن ہے اُنھوں نے ایسا کیا ہو''۔

''بات ہضم نہیں ہوئی''

''تمھارا ہاضمہ خراب ہے میرا علم بھی یہی کہتا ہے کہ وہاں رُکنا خطرناک ہے''

''علم؟''

''ہاں تم تو جانتے ہی ہو......''

تو بات یہاں تک پہنچ گئی تھی۔ پچھلی بار جب وہ آیا تھا تو اس نے مجھے بتایا کہ وہ اپنے اندر ایک روحانی طاقت محسوس کرر ہا ہے۔ ایسی طاقت جو آنے والے واقعات کی پیش گوئی کرسکتی ہے۔ وہ کسی بھی عورت کو اپنے علم کے زور پر بستر پر بلا سکتا ہے اور جنسی تعلقات قائم کرسکتا ہے۔ میں نے اسے ڈانٹا تھا کہ وہ بلو فلمیں دیکھنا چھوڑ دے اور جلد شادی کرلے۔ پتہ نہیں گھر والوں کا اصرار تھا یا وہ پہلے سے پروگرام بنا کر آیا تھا یا میرا مشورہ اس نے قبول کرلیا تھا۔ اس نے عاشی سے شادی کرلی۔ انجینئر تھا۔ ہاتھ پیر صورت شکل کا اچھا خاصہ تھا۔ مذہبی خیالات تھے۔ بیرونی ملازمت تھی۔ نئے شہر میں بہت بڑا مکان بنوالیا تھا۔ عاشی جیسی خوب صورت لڑکی کا ملنا کوئی عجب بات نہیں تھی۔ شادی کے بعد وہ صالح نوجوانوں کی طرح اپنی بیوی کے ساتھ کمرے میں بند ہوگیا۔ چوبیس گھنٹوں میں بہت کم باہر نکلتا، صرف مجھے ملنے کی اجازت تھی۔ باقی دوست تو ناراض ہوگئے تھے......اب وہ ایک مہینے میں واپس آگیا تو میں نے سوچا عاشی کے عشق میں چلا آیا ہوگا۔ لیکن یہ انڈرورلڈ؟ اس بار اس نے عاشی کے ساتھ زیادہ وقت نہیں گزارا۔ وہ مختلف دوستوں اور رشتہ داروں سے ملتا رہا۔ کسی کی موت کی پیش گوئی کردی۔ کسی کو لو میریج کے مضر اثرات پر لکچر دے دیا۔ کبھی دعوتوں پر بے جا اصراف پر تقریر ہوتی۔ کبھی مسلمانوں کی پستی اور انتشار کے اسباب بیان کرنے لگتا۔ اکثر اپنے بھائی سے اُلجھا رہتا کہ اس نے مکان کی تعمیر ٹھیک سے نہیں کروائی۔ باتھ روم کے ٹائلز ٹھیک نہیں ہیں۔ لوگ اس سے کترانے لگے۔

ایک روز آنٹی کا فون آیا کہ فرحان اچانک بے ہوش ہوگیا ہے۔ اسے دواخانہ لے جا رہے

ہیں۔ میں نے دواخانے کا نام پوچھا اور سیدھے دواخانہ پہنچ گیا۔ کچھ ٹسٹ لئے گئے تھے۔ کچھ دواؤں اور انجکشنوں کے بعد وہ ہوش میں آ گیا۔ اس کی آنکھیں سرخ انگارہ جیسی تھیں۔ ہفتہ بھر دواخانے میں رہ کر بے تکی باتیں بھی چھوڑ دی تھیں...... عاشی اس کی جی جان سے خدمت کر رہی تھی۔ ایک رات جب وہ عاشی کے ساتھ تنہا تھا اس نے آدھی رات کو اچانک چلّانا شروع کر دیا۔ گھر کے سارے لوگ گھبرا کے اُٹھے۔ وہ چیخ چیخ کر کہہ رہا تھا کہ وہ اس عورت کے ساتھ نہیں رہ سکتا.....

اس کی ماں نے پوچھا کہ وہ ایسا کیوں کہہ رہا ہے۔

اس نے جواب دیا جیسے ہی اس کی آنکھ لگی کمرے میں کوئی آیا اور اس کی بیوی کے ساتھ...... عاشی گھبرا کے کمرے میں بھاگی اور پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔ سب نے اسے سمجھانے کی کوشش کی تو وہ اور بگڑ گیا۔ گھر کا سامان اُٹھا اُٹھا کر پھینکنے لگا۔ اس نے ماں سے کہا کہ وہ اسی وقت عاشی کو اس کے گھر چھوڑ آئے۔ بڑی مشکل سے اسے سمجھایا گیا کہ اتنی رات گئے ایسا کرنا ممکن نہیں، صبح وہ اسے چھوڑ آئیں گے۔ رات بھر وہ جاگتا رہا اور بے چینی سے ٹہلتا رہا۔ وہ سب اسے دم بخود دیکھتے رہے کہ پتہ نہیں وہ کیا کر بیٹھے۔ صبح صبح وہ بستر پر لیٹتے ہی سو گیا۔

صبح آنٹی کا فون آیا۔ جب میں وہاں پہنچا تو سب ڈرائنگ روم میں بیٹھے تھے۔ وہ بڑے جوش میں سسرال والوں سے بحث کر رہا تھا۔ عاشی کی آنکھوں سے آنسو بہہ رہے تھے۔ وہ آنٹی کے پیچھے بیٹھی تھی۔ مجھے دیکھ کر وہ اندر چلی گئی۔

آپ اپنی بہن کو گھر لے جائیے وہ عاشی کے بھائی سے کہہ رہا تھا۔

''بلا وجہ؟''

''سب سے بڑی وجہ تو یہ ہے کہ میں بے روزگار ہوں۔ خود ہی بوجھ ہوں، دوسروں کا بوجھ کیا اٹھاؤں گا''۔

''لیکن بیٹے ہم سب ہیں نا۔ تم ایسا کیوں سوچ رہے ہو؟'' آنٹی نے کہا

''آپ تو خاموش ہی رہیۓ...... میں ایسی کمائی کا ایک پیسہ بھی نہیں خرچ کرنا چاہتا''۔

اس نے غصے میں کہا

''کیسی کمائی'' آنٹی نے پوچھا۔

''مظہر بھائی'' اس نے مجھ سے مخاطب ہو کر کہا مخاطب کر کے کہا ''وہ سب میری آنکھوں میں دھول جھونک رہے ہیں، میرا بھائی خود ملوث ہے اس میں''۔

''میں نے کیا کیا؟'' اس کا بھائی گھبرا گیا، پکا مذہبی آدمی تھا۔

''میں جیسے ہی منہ دھونے باتھ روم میں گیا عاشی اور میرا بھائی......''

''کمینے خدا تجھے غارت کرے'' آنٹی نے دانت پیس کر کہا اس نے سنا نہیں۔

''لیکن فرحان یہ کیسے ممکن ہے'' میں نے اسے سمجھانے کی کوشش کی۔

''سب ملے ہوئے ہیں مظہر بھائی۔ میری ماں، میری پھوپھی، میرا بھائی۔ سب سازش میں شریک ہیں۔ ان کی موجودگی میں محلّہ کے سارے نوجوان گھر آتے ہیں اور میری بیوی کے ساتھ...... ذرا میں گھر سے نکلا دھندا شروع...... مجھے کہتے ہیں میں بیروزگاری کی فکر نہ کروں۔

اس کے سالے کو اتنا غصہ آیا کہ وہ مارنے کے لئے اُٹھا۔ میں نے اسے پکڑ لیا۔

''عاشی چلو میرے ساتھ اس ذلیل آدمی کے ساتھ ایک منٹ رہنے کی ضرورت نہیں''

''ہاں دھندے کے لئے وہی جگہ ٹھیک ہے''

''فرحان'' عاشی کا بھائی چیخا اور جھپٹ کر اس نے فرحان کا گلا پکڑ لیا۔ عاشی تڑپ کر دونوں کے درمیان آ گئی۔

''ان پر ہاتھ نہ اُٹھائیے...... آپ چلے جائیے پلیز......''

عاشی کو درمیان میں دیکھ کر فرحان بھی شیر ہو گیا'' مارنا چاہتے ہو نا۔ مارو...... میں بھی دیکھتا ہوں کتنا دم ہے'' عاشی کا بھائی عاصم کمرے سے نکل گیا۔

فرحان بھی صوفے پر بیٹھ گیا۔آنٹی ایک گلاس میں پانی لے آئیں۔اس میں اُنھوں نے نیند کا جزر کھنے والی گولیاں گھول دیں۔اس نے پانی پی لیا۔

''مظہر بھائی مجھے مسلسل یہی جھلکیاں دکھائی دیتی ہیں۔میری بیوی اور مختلف جسم...... میں تنگ آ گیا ہوں'' ......وہ اونگھنے لگا۔پھر وہ کمرے میں جا کر سو گیا۔عورتیں بھی چلی گئیں۔اس روز میں رات میں وہیں رہ گیا۔

صبح اس کا بھائی ایک عامل کو لے آیا۔اس نے کوئی اعتراض نہیں کیا۔عامل اس کے سر پر ہاتھ رکھ کر کچھ پڑھنے لگا۔وہ سر جھکائے سنتا رہا۔

''کچھ نظر آیا؟'' عامل نے پوچھا۔

''ہاں''

''کیا؟''

''بطخ......''

عامل پھر سے پڑھنے لگا۔کافی دیر تک پڑھتا رہا۔

''کچھ نظر آیا؟''

''ہاں''

''کوئی چہرہ؟'' اس کی آنکھیں چمکنے لگیں۔

''بندر کا......''

''غور سے دیکھو'' عامل گرجا۔

اس نے آنکھیں کھولیں اور لپک کر عامل کی داڑھی مٹھی میں جکڑ لی۔عامل تکلیف کے مارے کراہنے لگا۔اس کی آنکھیں حلقوں سے اُبلنے لگیں۔بڑی مشکل سے ہم نے اسے چھڑایا۔ عامل گھبرا گیا۔بہت طاقت ور ہے......میرے بس کی بات نہیں ہے......وہ بھاگ گیا۔وہ ہتھے سے

اکھڑ گیا۔اس نے بھائی پر حملہ کر دیا۔ ماں درمیان میں آئیں تو انھیں ایک طرف دھکیل دیا۔ عاشی سامنے آ گئی تو وہ عاشی کا گلا گھونٹنے لگا۔ میں نے اسے چھڑانے کی بھرپور کوشش کی۔ پتہ نہیں فرحان کے پاس کونسی شیطانی طاقت تھی۔اس نے عاشی کی گردن چھوڑ دی۔وہ ایک جھٹکے سے نیچے گری۔

''اُف!'' وہ سر پکڑ کر بیٹھ گئی۔

''کیا ہوا......کیا ہوا...... تمھیں'' اس کی پھوپھی نے دانت پیس کر کہا۔سب نے فیصلہ کر لیا کہ اسے دماغی ڈاکٹر کو دکھائیں گے اور ضرورت پڑی تو پاگل خانہ بھیج دیں گے۔ بھائی کی بیوی بچوں کے ساتھ مائکے جا کر رہنے لگی۔ آنٹی نے کہا کہ اگر عاشی کو بھی خوف ہو رہا ہے تو وہ بھی چلی جائے لیکن عاشی نے انکار کر دیا۔

میں بہت دیر تک عاشی اور فرحان کے بارے میں سوچتا رہا۔ وہ ڈھونگ کر رہا ہے؟ اپنی بیوی سے چھٹکارا حاصل کرنا چاہتا ہے۔لیکن کیوں؟ کیا وہ جنسی اعتبار سے ناکام ہے۔لاشعور میں کوئی خطرہ تو نہیں کہ اس کی ناکامی اس کی بیوی کو آبرو باختہ بنا دے گی؟ کوئی ڈپریشن تو نہیں، فرسٹریشن تو نہیں۔ کثرت سے بلو فلموں دیکھنے کا نتیجہ تو نہیں۔اور عاشی؟ ایک ہندوستانی عورت مثالی بیوی...... جو ڈولی میں بیٹھ کر سسرال آتی ہے اور اس کا جنازہ ہی وہاں سے نکلتا ہے۔مجازی خدا، پتی پرمیشور، پتی کے چرنوں کی داسی، پتی کے پیروں کی دھول سے مانگ سجانے والی، اگر سجدہ جائز ہوتا تو شوہر کو کیا جاتا......

ڈاکٹر کے پاس چلنے میں اس نے کوئی مزاحمت نہیں کی۔ عاشی بھی ساتھ آئی۔ڈاکٹر کو اس نے پوری کیفیت بتائی۔ میں نے عاشی کو باہر بھیج دیا اور ساری باتیں بتائیں۔اس نے کہا کہ وہ چوبیس گھنٹے یہی منظر دیکھتا ہے۔

اس روز کے بعد کوئی عامل گھر نہیں آیا......اس کا بھائی صرف کیفیت سنا کر وظیفے پڑھتا رہا اور موقع دیکھ کر پھونک مارتا رہا۔کبھی چوری سے کوئی نقش پلا دیا جاتا۔ عامل نے کہا کہ اس نے بد

روح کو بھگا دیا ہے۔اب سب ٹھیک ہو جائے گا۔وہ بدروح ہی ویسے مناظر دکھا رہی تھی۔

دواؤں اور دعاؤں سے وہ ٹھیک ہونے لگا۔اس نے کوئی ہنگامہ نہیں کیا۔زیادہ تر سوتا رہتا۔ بھائی کے بچے اور بیوی بھی واپس آ گئے تھے وہ ان کے ساتھ کھیلا کرتا۔اس نے کسی کے ساتھ بدتمیزی نہیں کی۔اس کا رویہ نارمل ہو گیا۔وہ پابندی سے علاج کروا رہا تھا۔بس ایک ہی فکر تھی کہ اسے ملازمت مل جائے۔لیکن اسے کچھ یاد نہیں آتا تھا۔دماغ کی سلیٹ صاف تھی۔اس لئے انٹرویو میں ناکام رہتا۔ڈاکٹر کا کہنا تھا کہ سب کچھ ٹھیک ہو جائے گا...... میں اکثر اس کی کیفیت لیتا رہا۔

قریب چھ مہینے ہو گئے ایک دن عاشی کا فون آیا میں نے فرحان کے بارے میں پوچھا

''اب تو ٹھیک ہیں......ملازمت کی تلاش میں رہتے ہیں''۔

''پھر؟''

''میں نے فیصلہ کر لیا ہے کہ فرحان کے ساتھ نہیں رہوں گی''۔

''کیوں؟'' میں اُچھل پڑا۔تم نے کیسے نازک وقت میں ساتھ دیا اُس کا...... جان کی تک پروا نہیں کی......''

''لیکن وہ بات اور تھی مظہر بھائی......''

''اب کیا ہوا؟''

''میں آپ کو کیسے بتاؤں۔ میں تو ویسی ہی رہ گئی۔ پہلے نفرت اور دیوانگی کی وجہ سے دور رہتے تھے اب شرمندگی اور احسان مندی کی وجہ سے دور رہتے ہیں...... میں انھیں اس عذاب سے نجات دلانا چاہتی ہوں...... عاشی نے کہا اور فون رکھ دیا''۔

☆☆☆

دھار

صبح جاگنے کے بعد اس نے حسب معمول شیو کرنا چاہا تو اسے اپنا شیونگ سیٹ جگہ پر نہیں ملا۔ سارا کمرہ دیکھ لیا۔ بچے بھی اس کے کمرے میں نہیں آتے تھے اس کی چیزوں کو کوئی ہاتھ نہیں لگاتا تھا۔ اسے سخت غصہ آیا۔ جب سے اس کا لڑکا واپس آ گیا تھا اس کا موڈ بے حد خراب رہنے لگا تھا۔ اس نے بیوی کو بلا کر ڈانٹا کہ وہ اس کی چیزوں کا خیال نہیں رکھتی۔ اس کی بیوی بھی حیران تھی کہ آخر شیونگ سیٹ کہاں گیا۔ اس نے گھر کا کونا کونا چھان مارا ہر ممکن جگہ دیکھ لی لیکن وہ سیٹ نہیں ملا۔

برسوں کی عادت تھی۔ چودہ برس کے عمر سے وہ برابر شیو کر رہا تھا۔ صبح جاگتے ہی پہلا کام یہی تھا۔ اتنے برس گزر گئے اس کے معمول میں فرق نہیں آیا تھا۔ آج تک کسی نے اس کی داڑھی بڑھی ہوئی نہیں دیکھی تھی۔ بیماری اور سفر کی حالت میں بھی وہ شیو کرنے سے کبھی نہیں چوکتا۔ تیز دھار کی بلیڈ جب تک اس کے گالوں پر نہ دوڑتی وہ خود کو تر و تازہ محسوس نہیں کرتا تھا۔ پنشن کے بعد اس کے بہت سے دوستوں نے شراب چھوڑ دی اور داڑھی بڑھا لی تھی۔ لیکن وہ آج بھی بہترین بلیڈ

اور قیمتی شراب استعمال کرتا تھا۔

کس کی حرکت ہوسکتی ہے؟اس نے سوچا۔

اس کا بیٹا تو مولوی ہے پورا مولوی......اس نے تو داڑھی رکھ چھوڑی ہے۔سیاہ شرعی داڑھی ۔اسے یہ سب پسند نہیں تھا۔ایک خاص حلیہ جس سے مذہبیت ٹپکتی ہو اسے بالکل پسند نہ تھا۔اس کا خیال تھا تمام مذاہب انسانوں کے لیے آئے ہیں، انسانوں سے نفرت کرنے کے لیے نہیں۔ سارے مذاہب کچھ خاص زمانے میں مخصوص حالات میں اس دور کے لوگوں کے لیے آئے تھے اب وہ پرانے ہو چکے ہیں موجودہ دور میں نا قابلِ عمل......سب اپنے مذہب کو بہتر سمجھتے ہیں۔کوئی کسی کی برتری تسلیم نہیں کرتا نتیجے میں کتنے تصادم ، کتنے فسادات ، کتنی جنگیں ہوئیں۔سارے مذاہب کے پیشوا عظیم انسان تھے اُنھوں نے ایک اچھے معاشرے کے لیے محنت کی۔آج بھی پرانی باتوں کو دہرانے کے بجائے ایسی ہی کوشش کی جانی چاہیے۔

اس نے اپنے بیٹے کو روکا نہیں۔وہ چاہتا تھا کہ وہ خود ہی اپنے طور پر دنیا کو برتے اور فیصلے کرے۔اسے دیکھ کر کوفت ضرور ہوتی تھی۔

اور اب اس کے لڑکے کو بڑے زور کا دھکا لگا تھا۔ویسے وہ بھی اندر سے ہل گیا تھا۔اِدھر کچھ برسوں سے وہ محسوس کر رہا تھا کہ اس کے نظریات کو پے در پے شکست ہو رہی ہے۔اس کی طرح سوچنے والے کم ہوتے جا رہے ہیں۔صارفیت کے طوفان میں سب بہہ رہے ہیں۔زیادہ سے زیادہ پیسہ کمانے کے لیے آدمی دنیا کے کسی بھی کونے میں جانے کے لیے تیار ہے۔

جب ملک تقسیم ہوا اِس وقت وہ جوان تھا۔ہر شخص بھاگ رہا تھا،تحفظ کے لیے،بہتر مستقبل کے لیے،مفت میں جائیداد حاصل کرنے کے لیے۔پاسپورٹ کی بھی ضرورت نہیں تھی،بس سرحد پار کرنا تھا۔اس کی ماں کا اصرار تھا کہ وہ اُدھر چلے جائیں۔لیکن وہ یہیں رہنا چاہتا تھا، اپنے ملک میں۔ جب بھی فسادات ہوتے اس کی ماں اس کی طرف سوالیہ نظروں سے دیکھتی لیکن اسے کوئی

شرمندگی نہیں ہوتی۔اس کے اپنے خواب تھے ،انسانیت پر بھروسہ تھا۔ جہالت دور ہو گی لوگوں کو شعور آئے گا تو سب ٹھیک ہو جائے گا۔ یہ سب مذہبی جنون ہے۔اُدھر بھی بہت چین اور سکون نہیں تھا۔ کچھ عرصہ بعد اسے معمولی سی سرکاری ملازمت مل گئی۔ وہ اسی میں خوش تھا۔شادی ہوئی۔ بچے ہوئے۔ بہت خوش حالی تو نہیں تھی لیکن وہ ایک باوقار زندگی گزار رہا تھا۔ بچے سرکاری اسکول میں پڑھتے تھے لیکن اچھا پڑھتے تھے۔

دوسری بار پھر وہ ایک کڑے امتحان سے اُس وقت گزرا جب خلیج کے راستے کھلے۔اس کے کئی دوست دولت سمیٹنے کے لیے بھاگے۔ بیوی نے اسے بہت سمجھایا لیکن وہ ٹس سے مس نہیں ہوا۔ وہ ایسے ملک کو نہیں جائے گا جہاں اسے دوسرے درجے کا شہری بن کر رہنا پڑے۔اس ملک کے قوانین ،طرز زندگی ،وہ تو گھٹ کر مر جائے گا۔

اس نے دھیرے دھیرے زندگی جوڑی۔شہر سے دور ایک ہاؤزنگ سوسائٹی کے تحت زمین خریدی اور برسوں میں رفتہ رفتہ گھر بنایا۔ پندرہ بیس برس میں اس علاقے کی صورت بدل کر رہ گئی۔ اب وہ شہر کا ایسا حصہ بن گیا تھا جس کی بے حد مانگ تھی۔ کالونی میں سب اس کے جاننے والے تھے۔اس کے ساتھ کام کرنے والے اس کے دوست جن کے ساتھ وہ شراب پیتا تھا،بحثیں کرتا تھا۔اسے وہ سب اسی کی طرح لگتے تھے۔لڑکے نے بھی سرکاری کالج اور یونیورسٹی سے پڑھ کر انجینئرنگ کرلی تھی،ایک فرم میں ملازمت بھی کر رہا تھا۔لڑکی کی شادی ہوگئی تھی۔ داماد خلیجی ملک میں ملازمت کر رہا تھا۔ بیٹی اور نواسے اس کے ساتھ تھے۔ بڑی حد تک وہ مطمئن تھا۔لیکن اندر سے سب کچھ اطمینان بخش نہیں تھا۔ پہلے وہ سوچا کرتا تھا کہ کسی بھی قوم کی زندگی میں پچیس پچاس برس کی کوئی اہمیت نہیں ہوتی۔ دھیرے دھیرے سب ٹھیک ہو جائے گا۔لیکن ایسا نہیں ہوا۔شخصیت پرستی اور موروثی نظام نے رنگ دکھایا۔ضدی عورت اور ناتجربے کار لڑکا خود بھی تباہ ہوئے اور ملک کو بھی تباہی کے راستے پر ڈال دیا۔ان کے بعد اونگھتے ہوئے بوڑھے نے تابوت کے آخری کیل جڑ دی۔

سب کچھ برباد ہوکر رہ گیا۔ ملک کو راتھ والوں کے قدموں میں ڈال دیا گیا۔

قدیم عبادت گاہ ہٹ دھرمی سے گرادی گئی تو بہت کچھ بدل گیا۔ کتنے لفظ بے معنی ہو گئے اور کتنے لفظ نئے مفہوم لے کر آئے۔ شیلا نیاس، کار سیوک، ڈھانچہ، ہندو راشٹر، بھارتیہ کرن، اگروادی، جہاد، بم بلاسٹ، انکاؤنٹر، نئی نئی دہشت پسند تنظیمیں، بڑی جارحانہ وطن پرستی آ گئی تھی۔ کچھ نئے لوگ اس منظر نامے میں اُبھر آئے تھے جن کا کام صرف زہر اُگلنا اور دھمکیاں دینا تھا۔ سیکولر کہلانے والے اپنی کلائیوں پر سرخ دھاگے باندھنے لگے تھے۔ اپنے بچوں کی شادی کے دعوت ناموں پر جلی حرفوں میں بسم اللہ اور اوم لکھا جاتا ہے۔ ایک بڑی طاقت تاش کے پتوں کی طرح بکھر کر رہ گئی تھی اور کل تک جو سوشلسٹ لیڈر تھے، بائیں بازو کے اخبارات شائع کرتے تھے وہ کٹر مذہبی جماعتوں کے تلوے چاٹنے لگے تھے۔

تبدیلی اس کی کالونی میں بھی آئی تھی۔ وہ خود کو اکیلا محسوس کر رہا تھا۔ شام کی محفلیں کبھی کے ختم ہو چکی تھیں۔ محلے کے بچوں نے اس کے نواسوں کا جینا دوبھر کر دیا تھا۔

پاکستانی...... پاکستانی......!

اس کے تن بدن میں آگ لگ جاتی تھی۔ جس ملک سے اس نے کوئی واسطہ نہیں رکھا، وہی اس کے بچوں کے سروں پر تھوپا جا رہا ہے۔ اس کے بچے پاکستان کے بارے میں زیادہ جانتے بھی نہیں تھے۔

''نانا جی وہ ہمیں پاکستانی کیوں کہتے ہیں'' وہ چپ رہا۔

''کیوں کہ ہم مسلم ہیں''۔ بڑے نواسے نے کہا۔

''کیا تمام مسلم پاکستانی ہوتے ہیں؟'' پھر سوال کیا گیا۔

اس نے کوئی جواب نہیں دیا، جھلا کر اسی وقت باہر نکلا۔ وہ کالونی کے بزرگوں سے ملا، صورتحال بتائی۔ کسی نے اس کی بات رد نہیں کی۔ لیکن اسے لگا جیسے صرف وہی بول رہا ہے، خلا میں

اس کے الفاظ بکھر رہے ہیں اور کوئی معنی نہیں دے رہے ہیں۔ پہلی بار اسے محسوس ہوا کہ شاید اب وہ یہاں نہیں رہ پائے گا۔ جو قومیں کمزور پڑ جاتی ہیں انھیں سلمس میں ڈھکیل دیا جاتا ہے۔ اپنا گھر فروخت کرتے وقت اسے تکلیف ہوئی۔ قیمت بھی وہ نہیں ملی جو بازار کی تھی۔

اپنے بیٹے اور بیوی کے مشورے سے وہ ایک ایسی بستی میں آ گیا جہاں وہ تحفظ محسوس کرتے تھے۔ بے ترتیب مکانات، سڑکیں خستہ حال، ہر نکڑ پر نوجوانوں کی ٹولیاں، لمبے لمبے کرتے اور اونچے پاجامے پہنے بزرگ، لمبی داڑھیاں، سر پر ٹوپیاں ...... سیاہ برقعوں میں گھومتی عورتیں، صرف آنکھیں کھلی رہتیں۔ نوجوان لڑکے جینز اور ٹی شرٹ پہنے موٹر سائیکلوں پر دندناتے پھرتے۔ راتوں رات دولت مند بن جانے اور بغیر محنت کے پیسہ کمانے کے خواب آنکھوں میں سجائے سر پر اُلٹی کیپ لگائے، جیبوں سے سیل فون کی گنگناتی موسیقی ...... ہر گھر کا کوئی نہ کوئی فرد بیرون ملک ملازم تھا...... نماز کا وقت ہوتا تو لاؤڈ اسپیکر پر اذانوں کا شور بلند ہوتا۔ اس ماحول میں اس کا دم گھٹنے لگتا۔

عجیب بستی تھی۔ سب کو سب کی خبر ہوتی تھی۔ کون کیا کرتا ہے، کیا کھاتا ہے کیا پہنتا ہے کس گھر میں کون مہمان آیا ہے۔ پتہ نہیں یہ ساری باتیں کیسے ایک دوسرے تک پہنچ جاتی تھیں۔ شروع شروع محلے والوں نے اسے بھی گھیر لیا۔ نمازیوں کی ایک ٹولی اس کے پاس آئی اسے ''راہِ راست'' پر لانے کی کوشش کی گئی۔ اس نے سختی سے کہہ دیا کہ گناہ اور ثواب کے بارے میں وہ ان سے زیادہ جانتا ہے۔ اب وہ عمر کی اس منزل میں ہے کہ کوئی تبدیلی آنے والی نہیں ہے وہ اپنی مرضی سے جینا چاہتا ہے۔ اس کی اصلاح کی کوشش نہ کریں۔ اس کے لہجے میں اتنی تلخی اور درشتگی تھی کہ دوبارہ پھر کسی نے ہمت نہیں کی۔ البتہ اس کا بیٹا محلے میں جلد ہی مقبول ہو گیا۔ وہ نماز کا پابند بھی تھا اور محلے کے نوجوانوں اور بزرگوں میں وقت بھی گزارتا تھا۔ بیوی بھی نماز کی پابند ہو گئی تھی۔

اس نے ایک معمول بنالیا تھا۔ صبح ہوتے ہی داڑھی بناتا، نہاتا، تفصیل سے اخبار پڑھتا، ناشتہ کرتا پھر لائبریری میں بیٹھ جاتا۔ دوپہر کے کھانے کے بعد کچھ دیر سو جاتا۔ شام میں کہیں کوئی

جلسہ کوئی میٹنگ ہوتی تو چلا جاتا یا اپنے کسی دوست کے گھر چلا جاتا۔ اپنے معمول کے دو تین پیگ لیتا۔ مختلف موضوعات پر گفتگو کر کے خود کو ہلکا پھلکا محسوس کرتا۔ جب کبھی معمول سے زیادہ ہو جاتی تو اس کے قدم ہلکے سے لڑکھڑانے لگتے وہ سیدھے بستر میں چلا جاتا۔ اس کی بیوی فرش پر بستر بچھا کر سو جاتی۔ احتجاج کا ایک نیا طریقہ اس نے نکالا تھا۔ محلّہ والے تو اسے بس باہر جاتے اور آتے ہوئے دیکھتے تھے۔ کسی سے اس کی ملاقات نہ تھی۔

قدیم عبادت گاہ کے گرنے کے تقریباً دس برس بعد جدید طاقت، تہذیب و معاشرت کی علامت دو عمارتیں اچانک گرا دی گئیں اور پھر بہت کچھ بدل گیا۔ عمارتیں گرتی ہیں تو بہت کچھ بدل جاتا ہے۔ پھر کچھ نئے لفظ آئے جن میں زیادہ شور تہذیبوں کا ٹکراؤ اور دہشت گردی کے خلاف ردعمل، ایٹمی ہتھیار رکھنے والے مما لک کا صفایا تھا۔

قدیم عمارت گری کہ جدید عمارتیں، نقصان اسی کا ہوا۔ اس کی پوزیشن خراب ہوگئی۔ یوں اس نے جنگ کے خلاف مظاہروں میں حصہ لیا۔ سمیناروں اور سمپوزیم میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیا۔ لیکن اسے محسوس ہوا یہ سب کچھ ایک انٹلکچول تفریح کے علاوہ کچھ بھی نہیں ہے۔ لوگ جنگ کی ہولناکی کو محسوس نہیں کرتے۔ ٹی وی پر جنگ کے مناظر ایسے ہی دیکھتے ہیں جیسے فیشن چینلس پر خوبصورت جسم' الیکٹرانک میڈیا نے میدان جنگ اور فیشن شو کے ریمپ کا فرق بھی مٹا دیا ہے۔

دوستوں سے بحث کرنے میں بھی اب کوئی لطف باقی نہیں رہا تھا۔ اس کی طرح سوچنے والے کم ہوتے جا رہے تھے۔ ایک رُخ یہ ہے کہ لوگ اُس بڑی طاقت کو ظالم کہتے ہیں لیکن اس خلیجی ملک کے حکمران کو ڈکٹیٹر نہیں کہتے۔ لوگ خودکش بم کی تائید تو کرتے ہیں لیکن بے گناہ مرنے والوں پر افسوس نہیں کرتے۔ دوسرا رُخ یہ ہے کہ کہیں بھی بم بلاسٹ ہوتا ہے، دہشت گردی ہوتی ہے تو اس کی طرف عجیب نظروں سے گھورتے ہیں جیسے ہر دہشت گردی کا ذمہ دار وہ ہو۔ پولیس راتوں رات اس کے محلّہ سے نوجوانوں کو پکڑ کر لے جاتی ہے۔

ان حالات میں اس کے لڑکے نے جب کہا کہ وہ مغربی ملک کو جا رہا ہے تو وہ چونک پڑا۔

''کیوں جانا چاہتے ہو؟''

''ظاہر ہے بہتر مستقبل کے لئے''۔

''کیوں کیا یہاں تمھارا کوئی مستقبل نہیں ہے؟''

''نہیں پاپا۔ ہمارے ملک کو اعلیٰ تعلیم یافتہ سوچنے والے ذہن کی ضرورت نہیں ہے''

''وہاں بھی تو اعلیٰ تعلیم یافتہ لوگ چھوٹے چھوٹے کام کرتے ہیں''۔

''وہ عبوری دور ہوتا ہے پاپا۔ پیسہ بھی معقول ملتا ہے''۔

''تو تم پیسہ کمانا چاہتے ہو؟''

''ہاں پاپا پیسہ موجودہ دور کی سب سے بڑی حقیقت ہے''۔

''لیکن مذہب تو قناعت پسندی......''

''مذہب پیسہ کمانے سے روکتا نہیں'' بیٹے نے بات کاٹ کر کہا ''اچھا اچھا...... بیٹے کے جارحانہ موڈ کو دیکھ کر وہ خاموش ہو گیا۔ اس نے اگر قناعت پسندی سے کام لیا، زیادہ پیسوں کا لالچ نہیں کیا تو ضروری نہیں کہ اس کا بیٹا بھی ایسا ہی سوچے۔ پہلے جو تعیش کی چیزیں کہلاتی تھیں اب وہ ضرورت بن گئی ہیں جس کے لیے پیسہ چاہیے۔ اس کے بیٹے کو اس کے انداز میں جینے کا موقع دینا چاہئے۔

زور وشور سے تیاریاں ہونے لگیں، کپڑے جوتے، سفر کا سامان، ضروری چیزیں وہاں کے موسم کے مطابقت رکھنے والی......ایک ایک تفصیل تھی اس کے بیٹے کے پاس اس ملک کی......

پھر سب نے نمناک آنکھوں سے وداع کیا۔ دعائیں دیں، امام ضامن باندھے......گھر لوٹے تو بڑا سونا پن محسوس ہونے لگا۔ اِدھر کئی دنوں سے بڑی گہما گہمی تھی۔ رات دیر گئے تک جاگنا۔ دوست احباب کا آنا جانا۔

بیٹے نے ممبئی سے فون کیا کہ پہنچ گیا ہے۔ پھر اس ملک کے پلین میں بیٹھنے سے قبل فون کرنے کا وعدہ کیا۔ رات میں اس کا فون آیا کہ وہ پلین میں بیٹھنے جا رہا ہے۔ وہ آرام سے سو گئے۔

صبح وہ جلدی ہی جاگا۔ بیٹے کے فون کا انتظار کرنے لگا۔ بیوی بھی فجر پڑھ کر مصلے پر بیٹھی تھی۔ کافی انتظار کے بعد بھی فون نہیں آیا تو وہ بے چین ہو کر ٹراویلنگ ایجنسی کے دفتر بھاگا جس کے ذریعہ اس کا بیٹا گیا تھا۔ ٹراویلنگ ایجنسی والے بھی کوشش میں لگ گئے۔ وہ گھر لوٹ آیا۔ بیوی گڑ گڑا کر دعائیں کرتی رہی۔ وہ بے چینی سے ٹہلتا رہا۔ پھر ٹراویلنگ ایجنسی والوں کا فون آیا کہ اس کا لڑکا وہاں پہنچ تو گیا ہے لیکن ایرپورٹ پر روک لیا گیا ہے۔ وہ پریشان ہو گیا۔ پتہ نہیں ایسا کیوں ہوا۔ کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا تھا۔ وہ فون کھڑ کھڑانے لگا جن دوستوں کے بچے اس ملک میں تھے یا خاندان کے افراد وہاں تھے ان سے گفتگو کی ممکن ہے کوئی صورت نکل آئے۔ لیکن بات نہیں بنی۔ رات بھر وہ بے چین رہا۔ یہ دوسری رات تھی۔ پتہ نہیں بیٹے پر کیا گزر رہی تھی۔

رات اس کے بیٹے کا فون آیا۔

''ہاں بیٹے کیا ہوا؟'' اس نے بے چینی سے پوچھا۔

''کچھ نہیں پاپا میں واپس آ رہا ہوں''۔

''کیا ہوا۔ کچھ بتاؤ تو''۔

''آ کر بتاؤں گا......'' بیٹے نے اپنی واپسی کی فلائیٹ کا وقت بتا دیا۔ صبح اس نے حسب معمول شیو کیا۔ وقت سے پہلے ہی ایرپورٹ پہنچ گیا۔ بیٹا واپس آ گیا۔ اس نے اسے گلے لگایا۔ ٹیکسی میں بیٹھنے کے بعد اس نے پوچھا ''کیوں روک دیا تھا اُنھوں نے؟''

''ان کا خیال ہے میری شکل بین الاقوامی دہشت گرد سے ملتی ہے''۔

''تم نے کچھ نہیں کہا؟''

''وہ لوگ کچھ سننے کو راضی ہی نہیں تھے۔ انکوائری کی گئی اس کے بعد چھوڑا''

’’کچھ ثابت نہ ہونے پر بھی واپس کر دیا‘‘۔

’’ہاں......‘‘

’’چلو یہی کیا کم ہے تم صحیح سلامت واپس آ گئے۔ اللہ جو کرتا ہے اس میں کوئی نہ کوئی مصلحت ہوتی ہے‘‘۔

اس کے بیٹے نے عجیب نظروں سے دیکھا۔ وہ شرمندہ ہو گیا۔ یہ کیسے الفاظ اس کے منہ سے نکل رہے ہیں۔

بیٹے کے اس طرح لوٹ آنے پر اسے بہت بڑا دھکا لگا۔ کیا اِن پر دنیا تنگ ہو رہی ہے۔ یہاں زہریلے بیانات روزانہ پڑھنے کو ملتے ہیں، نسل کشی کا ایک کامیاب تجربہ کیا جا چکا ہے، ظالم ہی حکومت بھی کر رہے ہیں۔ خلیجی ممالک اپنے ملک میں پیدا ہونے والے بچوں کو بھی شہریت نہیں دیتے۔ مغربی ممالک کا یہ رویہ ہے۔

بیٹے کے بارے میں وہ کوئی اندازہ نہیں کر سکا کہ اس واقعہ کا اس پر کیا اثر ہوا۔ اس نے پرانی ملازمت جوائن کر لی تھی۔ کام میں مصروف تھا۔ ممکن ہے اس نے بیرونِ ملک جانے کا خواب دیکھنا ہی چھوڑ دیا ہو۔

آئینے میں اس نے اپنا چہرہ دیکھا۔ اچھی خاصی داڑھی نظر آ رہی تھی۔ سفید سفید...... تیز دھار کی بلیڈ کے لیے وہ بے چین ہو گیا۔ اس کی بیوی بار بار کہہ رہی تھی کہ وہ دوسرا شیونگ سیٹ خرید لے یا باہر جا کر داڑھی بنوا آئے، اس کا چہرہ اچھا نہیں لگ رہا ہے۔ لیکن وہ کاہلی سے گھر میں پڑا رہا۔ بیٹا آفس کے کام سے شہر سے باہر گیا ہوا تھا۔ وہ شام تک باہر نہیں نکلا، معمول کے دو پیگ بھی نہیں لیے۔ دن بھر پڑھتا رہا یا ٹی وی پر خبریں دیکھتا رہا۔

اس کی بیٹا اجازت لے کر کمرے میں آ گیا

’’پاپا یہ لیجئے آپ کا شیونگ سیٹ میں لے گیا تھا۔ آپ سے پوچھے بغیر...... آئی ایم سوری

پاپا......''لڑکا ایک سانس میں کہہ گیا۔

''تمھیں کیا ضرورت پڑی اس کی ......'' اس نے کہا۔نظر اُٹھا کر بیٹے کی طرف دیکھا تو حیرت زدہ رہ گیا اس کے بیٹے کے چہرے پر داڑھی برائے نام رہ گئی تھی۔

''تمھاری داڑھی؟'' اس کے منہ سے بے اختیار نکلا۔

''آہستہ آہستہ کم کردی۔اب کلین شیو ہو جاؤں گا''۔ بیٹے نے ہنستے ہوئے کہا

''لیکن کیوں؟''

''نیا پاسپورٹ بنواؤں گا کلین شیو تصویر کے ساتھ......''

''لیکن یہ کیسے ممکن ہے ریکارڈ ہوتا ہے...... باضابطہ......''

''یہاں سب کچھ ممکن ہے پاپا۔بس سورس چاہئے۔اس بار کہیں اور جاؤں گا''۔

''لیکن یہ غیر قانونی ہے''۔

''کیا بغیر داڑھی کے پاسپورٹ بنوانا غیر قانونی ہے؟''

وہ خاموش ہو گیا، بحث نہیں کی۔

''صرف داڑھی رکاوٹ بن گئی ہے پاپا......'' یہ لیجئے آپ کا سیٹ''۔

''نہیں''۔وہ کچھ سوچتے ہوئے بولا ''اسے تم ہی رکھ لو''۔

لڑکے نے حیرت زدہ نظروں سے اس کی طرف دیکھا۔

اس نے آئینے میں اپنا چہرہ دیکھا اپنی بڑھی ہوئی داڑھی پر ہاتھ پھیرا۔ایسے بھی وہ بُرا نہیں لگ رہا ہے۔اس نے اپنے آپ سے کہا اور معنی خیز انداز میں مسکرا دیا۔

☆☆☆

شکستہ پر

دس برس بعد سمیر اور سشما کی ملاقات ہوئی تو دونوں نے شادی کا فیصلہ کرنے میں دیر نہیں لگائی اور ایک روز چپکے سے شادی بھی کرلی۔ ان برسوں میں دور رہ کر دونوں کافی کچھ کھو چکے تھے۔ سشما نے جب اپنی ممی کو شادی کی بات بتائی تو اُنھوں نے صرف اتنا ہی کہا کہ وہ فوراً گھر چھوڑ کر سمیر کے پاس چلی جائے۔ ساتھ ہی سمن کو بھی لے جائے۔ جس کی اولاد اسی کے ساتھ رہے تو بہتر ہے۔ سشما کے پاپا نے ہمیشہ کی طرح خاموش تماشائی کا رول ادا کیا۔

اور سشما سمیر کے گھر آ گئی۔ لیکن سمن نے آنے سے صاف انکار کر دیا۔

''میں سمجھاؤں گا اسے''۔ پاپا نے کہا۔

سمیر کے گھر آ کر سشما کو ایک کھلی فضاء کا احساس ہوا۔ کتنے دنوں سے وہ گھٹ رہی تھی۔ زندگی اسے اس طرح واپس ملے گی، اس نے سوچا ہی نہ تھا۔ نہ یہ کہ وہ خود اپنی زندگی جیے گی۔

خواہشوں کے پرندوں نے ایک ساتھ زور لگایا اور جال سمیت اُڑنے لگے۔ خوابوں کی

گڑیاں جنھیں اس نے دل کے کسی کونے میں پھینک دیا تھا۔ ایک ایک کر کے نکالیں۔ ان کی گرد صاف کر کے بڑے چاؤ سے سجانے لگی۔

کھانے کی میز پر پہلا نوالہ اپنے ہاتھ سے سمیر کو کھلانا اور اس کے ہاتھ سے خود پہلا لقمہ لینا ......آفس جاتے وقت گال یا ہونٹ آگے بڑھا دینا......

آفس پر دو تین فون ...... لنچ کیا کہ نہیں؟ جلد گھر آجایئے۔ آتے ہوئے پزا ہٹ پر آرڈر دیتے آیئے۔

خوبصورت بیڈ۔ بے داغ چادر پر گلاب کی پتیاں بکھیر دینا۔ سوتے میں کوئی پتی گال یا جسم کے کسی حصے پر چپک جائے تو اسے ہونٹوں سے نکالنا۔

دونوں کا ایک سفید چادر اوڑھے برہنہ سونا۔ رات دیر گئے تک فیشن چینل اور گندی گندی فلمیں دیکھنا۔

صبح انگریزی فلموں کی ہیروئین کی طرح چادر میں جسم لپیٹے باتھ روم کے دروازے تک جانا اور ایک دم چادر چھوڑ کر باتھ روم میں گھس جانا۔

شاور کے نیچے اکٹھے نہانا۔

گریٹنگ کارڈ پر دستخط کی جگہ لپ اسٹک سے رنگے ہونٹوں کے نشان ثبت کرنا۔ ویک اینڈ پر لمبی ڈرائیو پر جانا۔ موٹر سائیکل پر سمیر کے ساتھ اس طرح چمٹ کر بیٹھنا کے درمیان سے ہوا بھی نہ گزر سکے۔ جسم کے سارے نشیب و فراز سمیر کی پشت میں مدغم کر دینا۔

کسی ریسورٹ میں جا کر واٹر گیمس کھیلنا، خوب بھیگنا اور ٹرانسپرنٹ ہو جانا۔

گھر میں جینز، شارٹس اور لنگریز پہن کر گھومنا، پابندی سے بیوٹی پارلر جانا، فیشل، پیڈی کیور، مینی کیور...... اسٹیپ کٹنگ۔

ہفتہ بھر میں اس کی تازگی لوٹ آئی۔ وہ جل تھل ہو گئی۔

۲

ایک روز دروازے پر سشما کے پاپا کے ساتھ سمن کھڑی تھی۔

’’اب یہ یہیں رہے گی‘‘۔ پاپا نے کہا۔

سشما نے مارے خوشی کے اسے لپٹا لیا۔

’’پاپا سمن مان گئی؟‘‘ اس نے حیرت سے پوچھا۔

’’تم اپنی ممی کو جانتی ہونا...... وہی کرتی ہیں جو چاہتی ہیں، سمن کے ماننے نہ ماننے سے کیا ہوتا ہے‘‘۔

اب جو بھی ہو، سشما نے سوچا، وہ ممی سے جیت گئی۔ سمیر کمرے سے باہر آیا۔

’’اب یہ تمھارا گھر ہے‘‘۔ پاپا سمن سے کہہ رہے تھے۔ ’’یہ تمہارے ڈیڈی ہیں‘‘۔

اُنھوں نے سمیر کی طرف اشارہ کر کے کہا۔ سمیر حیرت زدہ رہ گیا۔ یہ وہی لڑکی ہے جو برسوں پہلے سشما کی انگلی تھامے اس سے ملی تھی۔

’’یہ میری بیٹی سمن ہے...... بیٹے وِش کرو‘‘۔

’’یہ سمن ہے‘‘۔ پاپا کہہ رہے تھے۔

’’ہیلو بیٹا‘‘ سمیر نے کہا۔

’’ہیلو انک......‘‘ سمن کی زبان لڑکھڑا گئی۔

’’آؤ...... ہمارے پاس بیٹھو‘‘۔ سمیر نے محبت سے کہا۔

تھوڑی دیر بعد جب پاپا لوٹ رہے تھے تو سمن انھیں چھوڑنے دروازے تک آئی۔

’’پاپا‘‘ اس کی آنکھوں میں آنسو چھلک رہے تھے۔

''میں آتا رہوں گا بیٹا۔تم بھی جب جی چاہے آسکتی ہو۔کیوں ثمینہ؟''

''ہاں۔ہاں۔کیوں نہیں''۔اس طرح ثمن گھر آگئی۔

ثمن چپ چاپ سی رہتی۔اکثر کالج کی کتابیں یا میگزین لے بیٹھتی۔شام کے کھانے کے بعد اپنے کمرے میں چلی جاتی۔اکثر کالج سے لوٹتے ہوئے بڑی ممی اور پاپا سے ملنے چلی جاتی۔ رات زیادہ ہوجاتی تو پاپا چھوڑ جاتے۔ثمینہ کو بہت بُرا لگتا۔جب ممی پاپا نے تعلقات ختم کردیے تو یہ کیوں ان کے پاس جاتی ہے؟ وہ اکثر سمیر سے اس کا ذکر کرتی اور بے بسی سے رونے لگتی۔ممی نے مجھے ماں بننے بھی نہیں دیا۔سمیر اسے دلاسہ دیتا کہ سب کچھ ٹھیک ہوجائے گا۔

چھٹی کا دن تھا۔سب دیر سے جاگے۔اطمینان سے ناشتہ کرنے لگے۔ثمینہ سمیر کو بتانے لگی کہ اس کی ممی نے کس طرح اس کی زندگی کو عذاب بنادیا تھا۔کم سنی میں شادی بھی انھیں کا فیصلہ تھا۔علیحدگی اور طلاق کا فیصلہ بھی اُنھوں نے ہی کیا تھا۔اور جب وہ گھر آگئی تو ملازمہ بنا کر رکھ دیا تھا۔

''ممی پلیز''۔ثمن نے ٹوکا۔

''کیا ہے؟''

''پلیز بڑی ممی اور پاپا کے بارے میں کچھ نہ کہیے، مجھے بُرا لگتا ہے''۔

''اور اُنھوں نے جو میری زندگی کو جہنم بنا کر رکھ دیا تھا۔اس کا کیا ہے؟''

''پتہ نہیں ممی کس نے کس کی زندگی کو جہنم بنایا ہے''۔وہ کھانا چھوڑ کر اُٹھ گئی۔

''ثمن!''ثمینہ نے تیز لہجے میں کہا۔

سمیر نے اسے منع کیا اور خود اس کے کمرے میں گیا۔ثمن غصے سے لیٹی ہوئی تھی۔

''بہت چاہتی ہو بڑی ممی کو......''

''ہاں پاپا کو بھی''۔

''اور اپنی ممی کو......؟''

وہ خاموش رہی۔

''تم نے جواب نہیں دیا؟''

''وہ مجھے ممی جیسی لگتی ہی نہیں''۔

''اچھا میں تو ڈیڈی جیسا ہوں نا؟''

''نہیں۔ڈیڈی جیسے تو پاپا ہیں''۔

''اور میں......؟''

''آپ اچھے ہیں، بہت اچھے''۔وہ سمیر سے لپٹ گئی۔

دھیرے دھیرے وہ کھلنے لگی۔وہ سمیر کو بے تکلفی سے ڈیڈی پکارنے لگی۔سمیر اس کی پڑھائی میں مدد کرتا۔آفس سے لوٹتے وقت بڑا سا چاکلیٹ یا برگر لے آتا۔کبھی اس کے ساتھ بیٹھ کر سیریل دیکھتا،سمن بھی کئی باتیں سمیر سے شیئر کرنے لگی تھی۔کبھی اس کے بازو پر،کبھی گود میں سر رکھ کر لیٹ جاتی اور کالج کے قصے سناتی۔کبھی دونوں مل کر اونچی آواز میں کوئی نیا گیت گانے کی کوشش کرتے اور جب بول یاد نہ آتے تو گانا چھوڑ کر ہنسنے لگتے۔سشما چائے اور پکوڑے تیار کرتی۔بہت دنوں سے وہ بڑی ممی اور پاپا کے پاس بھی نہیں گئی تھی۔

اس صورت حال سے سشما بے حد خوش تھی۔سشما کو خوف تھا کہ پتہ نہیں سمیر سمن کو قبول کرے گا بھی یا نہیں۔لیکن اب سمن سشما سے زیادہ سمیر کی دوست تھی۔دونوں نے ہر طرح سے اس کی دل جوئی کی۔چند دنوں میں ہی سمن کے اندر کی ہنس مکھ، بے تکلف بے باک لڑکی باہر نکل آئی۔

۳

سمن سے مطمئن ہو کر سشما پھر سے اپنی دنیا میں لوٹ آئی۔

ناشتے کی میز پر سشما نے پہلا نوالہ سمیر کی طرف بڑھایا۔ سمن نے بھی بڑی پھرتی سے سمیر کو نوالہ پیش کیا۔

''ڈیڈی پہلے میرا نوالہ''۔

سمیر نے سمن کا نوالہ لے لیا۔ سشما نے شکایتی نظروں سے سمیر کی طرف دیکھا اور وہ نوالہ پلیٹ میں واپس رکھ دیا۔

''ممی کو بھی کھلاؤ''۔

''نہیں......'' سمن نے ہنس کر انکار کر دیا۔

''ممی کو ہم کھلائیں گے''۔ سمیر نے سشما کے چہرے کا رنگ بدلتا دیکھ کر کہا۔

''رہنے دیجئے''۔ سشما نے کہا اور چپ چاپ سر جھکائے کھانے لگی۔

''ارے بھئی بچی ہے''۔ سمیر نے سشما کو سمجھایا۔

''بچی ہے تو بچی کی طرح رہے''۔ سشما نے کہا۔

اس دن کے بعد وہ سب اپنا اپنا کھانا کھانے لگے۔ ایک دوسرے کو کھلانے کی بات ہی ختم ہو گئی۔

''اڑتے ہوتے جال میں ایک پرندہ پھڑ پھڑا کر مر گیا......

سمن اب ہر معاملے میں دخل دینے لگی تھی۔ انداز یہ ہوتا کہ اس کی معلومات سشما سے زیادہ ہیں۔ رات دیر گئے، سشما اور سمیر کوئی سیریل دیکھ رہے تھے۔ وہ اچانک آ گئی۔ سمیر کا بازو پکڑ

کراس کے پاس بیٹھ گئی۔دوسری جانب سشما تھی۔اچانک Bay Watch کا اشتہار آیا۔سشما نے آنکھوں سے سمیر کو اشارہ کیا کہ ذرا نیم عریاں پامیلا اینڈرسن کو دیکھئے۔

''وہ پامیلا اینڈرسن ہے۔اس نے امپلانٹیشن کروایا ہے ممی۔ہمارے ہاں سشمتا سین نے انڈین اسٹینڈرڈ کے مطابق امپلانٹیشن کروالیا۔لیکن دیر اِز نو یوز اِن انڈیا (There is no use in India)۔''

''سمن......'' سشما نے ڈانٹا۔''جاؤ اپنے کمرے میں......'' وہ اپنے کمرے میں چلی گئی۔ سشما اس کے پیچھے تیز قدموں سے گئی۔

''تمھیں شرم نہیں آتی اس طرح کی باتیں کرتے ہوئے۔ڈیڈی بیٹھے ہیں''۔

''اس میں شرم کی کیا بات ہے؟ کیا ڈیڈی نہیں جانتے۔روز تو بڑے بڑے اشتہارات چھپتے ہیں تصویروں کے ساتھ۔امپلانٹیشن، ریڈکشن، لفٹنگ، سلمنگ ......ٹی وی پر کئی مستقل چیانلز ہیں ان چیزوں کے۔!'' سمن نے کہا۔

''تو کیا تم ہم سے ایسی باتیں کرو گی؟''

''پھر کس سے کروں؟ کیا ممی آپ بھی اتنی موڈ ہو کر......''

سشما خاموش ہو گئی۔ چار پانچ برس میں کتنا کچھ بدل گیا۔میوزک چیانلس کی اینکرس، ایئم گرلس، ری مکسنگ گرلس، جیسے ساری جوان لڑکیاں ننگی ہونے کو اتاؤلی ہو رہی ہیں۔شہرت پانے کا یہی شارٹ کٹ ہے۔ٹی وی اور انگریزی میگزینوں اور اخباروں نے وقت سے پہلے ہی بچوں کو ذہنی طور پر بالغ کردیا ہے۔سمن تو ابھی بچی ہے، جب عقل آئے گی تو خود ہی سیکھ جائے گی کہ کہاں کس موقع پر کیا بات کرنا چاہیئے۔

''بچی ہے......!'' سشما نے سوچا۔

۴

چھٹی کسی ریسورٹ پر گزارنے کا پروگرام بنا۔

سشما اور سمیر کئی بار جا چکے تھے۔ اب سمن کا اضافہ ہوا تھا۔ سمیر اور سشما کے درمیان سمن بیٹھ گئی۔ سمیر نے بھی ٹی شرٹ اور جینز پہنی تھی اور اپنی عمر سے کم لگ رہا تھا۔ ریسورٹ میں اور بھی فیملیز تھیں۔ ایک طرف سوئمنگ پول اور واٹر گیمس تھے، مصنوعی آبشار بنے تھے۔ سشما اور سمیر پانی میں اُتر گئے۔

''ممی میں بھی آجاؤں؟'' سمن نے پوچھا۔

''ہاں...... ہاں...... آجاؤ......''

سمن شلوار سنبھالے پانی میں اُتر گئی۔ اچانک سشما کو شرارت سوجھی۔ اس نے سمیر پر پانی اُڑانا شروع کر دیا۔ سمیر کو سنبھلنے میں کچھ دیر لگی۔ پھر اس نے شدت سے جوابی حملہ کرنا شروع کیا تو سشما سنبھل نہ سکا۔ سشما کی تائید میں سمن نے سمیر پر پشت سے حملہ کر دیا۔ سمیر نے اب سمن کو نشانہ بنایا۔ تینوں سر سے پیر تک بھیگ گئے۔ سمیر اور سشما تو جینز پہنے ہوئے تھے۔ لیکن ٹی شرٹ اور شارٹ بھیگ کر جسم سے چمٹ گئے تھے۔ سشما کی سرخ برا اور سینے کا وہ حصہ جو برا کی قید سے آزاد تھا صاف جھل رہا تھا۔

سشما تھک گئی۔ ''سمیر اب بس...... بس کرو پلیز''۔

سمن تازہ دم تھی اور مسلسل سمیر پر حملہ کر رہی تھی۔ سمیر نے سشما پر پانی اُڑانا بند کیا تو اس کی نظر سمن پر پڑی۔ وہ بُری طرح چونکی۔ اُف وہ بدن ایک مکمل جوان لڑکی کا تھا۔ سمن کے اندر اتنی خوب صورت لڑکی چھپی ہے، اسے پتہ ہی نہ تھا۔ سمن کے کپڑوں سے بدن کی تیز کرنیں پھوٹ رہی

تھیں۔ سشما کی آنکھیں چندھیا گئیں۔ اسے صرف دو چمکتے سورج ہر طرف دکھائی دینے لگے۔ اسے شدید احساس کمتری ہونے لگا۔ اس کا بدن تو مکمل ہو گیا تھا۔ لیکن تکمیل کے مراحل طے کرنے والا بدن کتنا خطرناک ہوتا ہے، اسے پہلی بار احساس ہوا۔ اس نے سچے دل سے دعا کی کہ سمیر کی نظر سمن پر نہ پڑے۔ وہ سمیر کی نظر کو جانتی تھی۔

''سمن...... چلو باہر نکلو...... اب بس بھی کرو''۔

''کیا ممی ابھی تو اُتری ہوں پانی میں......''

''اسی لیے کہہ رہی ہوں باہر آجاؤ۔ سردی لگ جائے گی''۔

سمن کے باہر آتے ہی اس نے اس کا بدن تولیے میں لپیٹ دیا۔

''جاؤ فوراً کپڑے تبدیل کرو''۔ سمن ڈریسنگ روم گئی تو سمیر نے پوچھا ''کیوں تمھارا موڈ ایک دم سے کیوں بدل گیا؟''

''اسے بہت جلد سردی لگ جاتی ہے۔ ہاتھ پھیر ٹھنڈے ہو جاتے ہیں''۔ سشما نے جھوٹ کہا۔

''ہاتھ تو تمہارے بھی ٹھنڈے ہیں'' سمیر نے سشما کا ہاتھ دبا کر کہا اور چپکے سے اسے چوم لیا۔ سشما کو اس کا یوں بوسہ چرانا اچھا لگتا تھا۔ وہ اس سے لپٹ گئی۔

''چلو کپڑے بدل لیں''۔

گیلے کپڑے دھوپ میں پھیلا دیے گئے۔ سمن نے ریکٹ نکالے۔

''چلو کھیلتے ہیں''۔ سمیر نے کہا۔

سشما کھیل نہیں پائی۔

''ممی میں کھیلوں؟''

''ہاں...... ہاں'' سشما نے ریکٹ سمن کو تھما دیا۔

دونوں بہت اچھا کھیل رہے تھے۔ سمن تو تھی ہی بچی لیکن سمیر بھی ساتھ دے رہا تھا۔ سشما نے دیکھا سمن کے بدن کے فتنے پھر جاگ رہے ہیں۔ جسم کی بوٹی بوٹی تھرک رہی تھی۔ سشما کی آنکھوں میں سورج اُبھرنے لگے۔

سشما کو اب سمجھ میں آیا کہ لوگ ویمنس ٹینس اتنی دلچسپی سے کیوں دیکھتے ہیں۔

''اب بس''۔ سشما نے اعلان کیا۔

''بس دومنٹ۔ بہت مزا آرہا ہے''۔ سمیر نے کہا۔

''کیا ممی آپ انجوائے کرنے ہی نہیں دیتیں۔ آپ کو ہمیشہ بھوک لگی رہتی ہے۔ کتنا ویٹ گین (Weight Gain) کررہی ہیں''۔

سمیر نے کھیل روک دیا۔ ''چلو ممی ناراض ہوجائے گی۔ پھر سارا مزا کرکرا کردے گی''۔ سمیر نے آہستہ سے کہا۔

کھانے کے بعد سشما لیٹ گئی۔ سمن سمیر کا ہاتھ تھامے بوٹنگ کرنے چلی گئی۔ دونوں بڑے مزے سے پیڈ لنگ کررہے تھے۔ سشما کے اندر کہیں سے خوف اُتر آیا کہ وہ سمیر کا ساتھ نہیں دے پارہی ہے۔ کئی بار وہ یہاں آچکے ہیں لیکن سمیر کو اتنا خوش اس نے نہیں دیکھا تھا۔

نہیں، وہ سمن کی دل جوئی کررہا ہے، پہلی بار ساتھ آئی ہے! بچی ہے!......نہیں وہ بچی نہیں ہے،اس کی آنکھوں میں سورج چمکے......

سشما خود کو تنہا محسوس کرنے لگی، وہ بھی سمن کی عمر کی تھی۔ اس کی شادی کردی گئی۔ پھر سال بھر میں وہ ڈرائیورسی کہلانے لگی۔ جوانی تو آئی ہی نہیں۔ دس برس سے وہ ماں باپ کی خدمت میں لگی ہے......اب شاید بھگوان کو اس پر رحم آیا ہے......اس کے اندر کی لڑکی جاگی ہے تو مقابل میں اس سے خوبصورت جوان لڑکی کھڑی ہے......کیا وہ پھر ہار جائے گی؟ نہیں!!

دونوں اسی کی طرف آرہے تھے۔

''چلوتم بھی چلو۔ بہت مزا آ رہا ہے۔ پیڈل میں مارلوں گا''۔سمیر نے کہا۔
''نہیں۔کچھ دیر آرام کرلو...... چائے پی کر واپس چلیں گے''
شام جب وہ واپس ہو رہے تھے تو سشما نے کہا کہ وہ سمیرا اور سمن کے درمیان بیٹھے گی......
اور پھر وہ اس طرح سمیر سے چمٹ کر بیٹھ گئی جیسے گرفت ڈھیلی ہوتے ہی سمیر اُڑ جائے گا۔
لیکن جال لے کر اُڑنے والے پرندوں میں سے ایک اور نے دم توڑ دیا تھا۔

۵

ممی، میں ساری باندھ کر جاؤں گی آج......''
''کیوں؟''
''کالج ڈے ہے۔ساری لڑکیاں ساری پہن کر آ رہی ہیں''۔
''ٹھیک ہے کوئی ساری سلیکیٹ کرلو۔بلاؤز کہاں سے لاؤ گی؟''
''آپ کا ٹرائی کرتے ہیں''۔
''میں تو موٹی بھدی عورت ہوں نا؟''اس نے طنز کیا۔
''مما پلیز۔دیکھنے میں کیا ہرج ہے''۔
''دیکھ لو''۔سشما نے بے دلی سے کہا اور کام میں مصروف ہوگئی۔
''دیکھو مما......''سمن بلاؤز پہن کر آ گئی۔تقریباً برابر تھا۔سشما حیرت زدہ رہ گئی۔سمن بظاہر تو ایسی نہیں لگتی۔
''میں جہاں جہاں ضرورت ہے اندر سے اسٹچنگ کرلوں گی۔اب لایئے تیسری چیز''۔

''کیا مطلب؟''

''یہ اندر کی بات ہے''۔

''میں سمجھی نہیں''۔

''ممی۔تھری لیٹر ورڈ۔ویری سمپل''۔سمن خوشگوار موڈ میں تھی۔''بی۔آر۔اے۔بی فار بیوٹی فل،آر فار راؤنڈ اینڈ اے فار ایپل''۔وہ کسی اسکول ٹیچر کی طرح بولنے لگی۔

''تمہارے پاس نہیں ہے؟اس روز بھی پکنک پر ویسے ہی آ گئیں''۔

''کہاں سے لاؤں گی مائی ڈیر ممی''۔

''اچھا اچھا چلو ٹھیک ہے''۔سشما نے کھسیا کر کہا۔''تم نے کبھی کہا بھی تو نہیں اور مجھے اندازہ نہیں تھا کہ تم......''

''تو پھر ٹرائی کر لیتے ہیں''۔

''کیا فائدہ۔تم بچی ہو ابھی''۔

سمن نے ٹرائیل کیا۔''ممی دیکھیے،ایک دم فٹ،آپ ہمیشہ انڈر اسٹیمیٹ کرتی ہیں''۔

سشما کے سارے حواس آنکھوں میں مجتمع ہو گئے تھے۔وہ دیکھتی رہ گئی۔کیا خوبصورت بدن تھا۔وہ دونوں سورج جنھوں نے اس کی آنکھوں کو چندھیا دیا تھا،اب پوری طرح روشن تھے۔وہ وہم یا گمان نہیں تھا۔حقیقت سامنے کھڑی تھی۔

''دیکھا مما''سمن نے فخر سے کہا۔

سشما سمن کے بدن کے سحر سے نکلی تو اسے ایسا لگا جیسے اسی لمحہ بوڑھی ہو گئی ہے۔لیکن وہ اتنی حیران کیوں ہے۔اس عمر میں تو اس کی شادی ہو گئی تھی،بلکہ وہ تو سمن کی ماں بھی بن گئی تھی۔لیکن اس نے کبھی اپنے جسم پر غور ہی نہیں کیا تھا۔شاید اس کا جسم ایسا تھا بھی نہیں۔اسے ایک بھرے بھرے جسم کی عورت نے شکست دی تھی۔اس کا شوہر اپنے بھائی کی بیوی کا دیوانہ تھا۔اسے اسی لیے

اسے اس گھر میں دلہن بنا کر لایا گیا تھا کہ اس کا شوہر اسے پا کر اپنی بھابھی میں دلچسپی لینا چھوڑ دے۔لیکن اپنی کم سنی کی وجہ سے وہ کچھ بھی نہیں سمجھ پائی اور اس عورت سے ہار مان کر گھر آ بیٹھی۔ اب جسم کے خالی حصے بھر گئے ہیں تو ایک کمسن لڑکی مقابل کھڑی ہے۔اس کی اپنی بیٹی۔!

٦

سمیر آفس سے لوٹا تو اس کی پسندیدہ ساڑھی باندھے سشما بالکونی میں کھڑی کچھ دیکھ رہی تھی۔ بہت ہی سلم اور خوبصورت لگ رہی تھی۔اسے دس برس پہلے کی سشما یاد آ گئی۔وہ دبے پاؤں آگے بڑھا اور ایک دم سے اسے گود میں اُٹھا لیا، کتنی ہلکی پھلکی لگ رہی تھا سشما۔!

چیخ سن کر سشما کچن سے باہر آئی۔سشما کو دیکھ کر سمیر کی گرفت ڈھیلی پڑ گئی۔سمن کے پیر فرش سے لگے۔سمن زور زور سے ہنسنے لگی۔سمیر جھینپ کر کمرے میں چلا گیا۔سشما اس کے پیچھے پیچھے آئی۔

تم اپنے کپڑے اسے کیوں پہننے دیتی ہو!''سمیر نے غصہ سے کہا۔

''آج اس کا کالج ڈے تھا''۔

سمیر کا موڈ خراب ہی رہا، کھانے کی میز پر بھی وہ سر جھکائے کھاتا رہا۔

''آپ اتنا مائنڈ کیوں کر رہے ہیں؟ مجھے تو بُرا نہیں لگا''۔سمن ے کہا اور سمیر کے گلے میں بانہیں ڈال دیں۔

''اچھا چلو ٹھیک ہے۔تم آؤ یہاں تمیز سے بیٹھو''۔سشما نے تلملا کر کہا۔

جب تک سمن گھر میں رہتی خود ہی بولتی رہتی۔سمیر کے پیچھے پیچھے گھومتی رہتی۔وہ سمیر سے

باپ جیسا سلوک کیوں نہیں کرتی ۔ یہ رشتہ تو احترام کا مطالبہ کرتا ہے۔ کیا یہ بات سمن کی سمجھ میں نہیں آتی؟

''وہ تمہارے ساتھ باپ کی طرح Behave کیوں نہیں کرتی؟''

''شاید میں ہی رشتے کا وہ احترام باقی نہیں رکھ پایا۔ ایک دم سے اتنی بڑی پلی پلائی لڑکی کا باپ بن کر بوکھلا گیا''۔

''طنز کر رہے ہو مجھ پر''۔

''ارے نہیں۔ تم فکر نہ کرو سب ٹھیک ہو جائے گا۔ ابھی بچی ہے''۔

مصیبت یہی ہے کہ وہ بچی نہیں ہے۔ سشما سمیر سے کہہ نہ سکی۔ سشما اپنی زندگی میں رنگ بھرنے کی بجائے سمن کے بارے میں تشویش میں مبتلا ہو گئی تھی۔ وہ سمن کو ممی کے پاس واپس جانے کے لیے بھی نہیں کہہ سکتی۔ وقار کا مسئلہ تھا۔ پھر وہ ضدی عورت مانے گی بھی نہیں۔

اسے اپنی ماں سے سخت نفرت تھی۔ ممی نے ہی اس کی شادی کم عمری میں کر دی تھی۔ علیحدگی کا فیصلہ بھی انھیں کا تھا۔ سمن کو اس کے باپ کو نہ دینے کا فیصلہ بھی اُنھوں نے ہی کیا تھا۔ جب اس کی ملاقات سمیر سے ہوئی تھی تو شادی کی سخت مخالفت بھی ممی نے ہی کی تھی۔ پھر سمن پر اس کا کوئی اختیار بھی نہیں تھا۔ ممی نے اسے کبھی ماں بننے کا موقع ہی نہیں دیا تھا۔ سمن نے کبھی اسے ماں سمجھا ہی نہیں۔ اور اب اچانک ممی نے سمن کو اس کے حوالے کر دیا۔ سمن کو ممی ہی نے بگاڑا ہے۔ لیکن اب کیا ہو سکتا ہے؟

ممکن ہے سمن کو اس کا اس عمر میں شادی کرنا اچھا نہ لگا ہو۔ ممکن ہے سمن سمیر کو باپ کا درجہ دینا ہی نہ چاہتی ہو۔ سمیر اس کی زندگی میں آنے والا پہلا مرد ہو......

جیسے جیسے سشما نے سمن پر نگرانی سخت کر دی، سمن نے اسے زیادہ ہی تنگ کرنا شروع کر دیا۔ جب وہ رات کوئی سیریئل دیکھ رہے ہوتے تو سمن آ جاتی، ''نیند نہیں آ رہی ہے''

کبھی وہ انتہائی نازک مراحل طے کر رہے ہوتے تو سمن زور زور سے دروازہ پیٹنے لگتی، ''ممی مجھے اکیلے میں ڈر لگ رہا ہے، میں آپ لوگوں کے ساتھ سوؤں گی''۔ اور وہ سشما کے برابر لیٹ جاتی۔ سشما کی پوری رات آنکھوں میں کٹ جاتی۔ کیا سمن یہ سب کچھ جان بوجھ کر کر رہی ہے؟

اس کشمکش میں پتہ چلا کہ سشما ماں بننے والی ہے۔ سشما اور سمیر بے حد خوش تھے۔ جب سمن نے سنا تو بُرا سا منہ بنا کر کہا۔

''ممی کیا ضرورت تھا...... سارا فیگر تباہ ہو جائے گا''۔

''مجھے سمیر کے پیار کی ایک نشانی چاہئے''۔

''کیا نشانیاں ہی جمع کرتی رہیں گی؟'' سمن نے کہا۔

''ہاں، کچھ اچھی نشانیاں بھی چاہئیں''۔ سشما نے جل کر کہا۔

سشما کو ماں بننے کی خوشی تو تھی لیکن ایک خوف بھی تھا۔ اس کا جسم بے ڈول ہوتا جا رہا ہے اور سمن بے باک ہوتی جا رہی ہے۔ وہ دن بھر کام کرتے کرتے تھک جاتی لیکن سمن اس کی ذرا بھی مدد نہیں کرتی۔ سمیر اس کا ہاتھ بٹانے لگا۔ سمیر کو سمن کا اس طرح بیٹھے بیٹھے حکم چلانا سخت ناگوار گزر رہا تھا۔ اس نے دبی زبان میں سمن سے کہا بھی ...... سمن نے باتوں باتوں میں صاف سمجھا دیا کہ وہ یہ سب نہیں کر سکتی۔ اتنے وقفے کے بعد سشما نے کیری کیا تھا۔ ڈاکٹر نے احتیاط کے لیے کہا تھا لیکن سمن کا یہ انداز ناقابل فہم تھا۔ کالج سے آتے ہی ایک طرف سینڈل اچھال دیتی۔ بیگ ایک طرف پھینک دیتی۔ منہ ہاتھ دھوئے بغیر کپڑے تبدیل کئے ریموٹ کنٹرول ہاتھ میں لے کر ٹی وی کے سامنے بیٹھ جاتی۔ سمیر کے گھر لوٹنے کا وقت ہوتا تو فریش ہو کر کپڑے تبدیل کر کے انتظار کرنے لگتی۔ کیا ہے اس لڑکی کے دل میں......؟

۷

اس شام سمیر جلد گھر آ گیا۔ سمن جلدی سے باتھ روم میں گھس گئی۔ منہ دھو کر سشما کا ایک شرٹ شلوار پہن لیا۔ سمیر نے سشما کی طرف گھور کے دیکھا۔

''تم نے میرے کپڑے کیوں پہن لیے۔ میں نے منع کیا تھا نا......'' سشما نے کہا۔

اونہہ۔ اب یہ آپ کے استعمال کے قابل تو رہے نہیں۔ آپ کو استعمال کرنے میں ابھی کافی دن ہیں۔ میں نے پہن لیا تو کیا ہوا؟''

سمن نے دوپٹہ بھی نہیں اوڑھا تھا۔ شرٹ کے گریبان سے موجوں کا مدوجزر صاف دکھائی دے رہا تھا۔

سشما کچن میں چلی گئی۔ اس نے سمن کو پکارا۔ وہ اسے بتانا چاہتی تھی کہ سمیر کو یہ بالکل پسند نہیں کہ وہ سشما کے کپڑے استعمال کرے اور گریبان......؟

سمن نہیں آئی۔

''ممی آپ ہی لائیے نا......پکوڑے......''

''تم آؤ''۔ سشما نے کہا۔

''نہیں ممی''۔

''میں آرہا ہوں''۔ سمیر نے کہا۔

''ارے نہیں۔ آپ بیٹھئے''۔ پسینے میں تر آہستہ آہستہ چلتے ہوئے سشما پکوڑے لے آئی۔

سمن ہنسنے لگی۔ ''ڈیڈی ذرا دیکھیے......'' پھر زور زور سے ہنسنے لگی۔

''شٹ اَپ۔ پاگل ہوگئی ہو؟'' سمیر چلاّیا، ''اِنف!''

سمن ایک دم خاموش ہوگئی۔ ایک جھٹکے سے اُٹھی۔ میز پر رکھی پلیٹ کو دھکا دیا۔ سارے

پکوڑے فرش پر بکھر گئے۔ وہ پیر پٹکتے ہوئے کمرے میں چلی گئی۔

سشما نے اس کے پیچھے جانے کی کوشش کی۔

''نہیں، اس کی ضرورت نہیں''۔ سمیر نے کہا۔

سشما نے عجیب سا اطمینان محسوس کیا۔

رات میں بھی کوئی اسے منانے نہیں گیا۔ صبح سمیر کے دفتر جانے تک وہ باہر نہیں آئی۔ سشما نے جھانک کر دیکھا۔ وہ سو رہی تھی۔

شام سمیر دفتر سے آیا تو سمن کہیں نظر نہیں آئی۔

''صبح گھر سے گئی تو اب تک واپس نہیں آئی''۔ سشما نے بتایا۔

''کہاں جا سکتی ہے! کسی سہیلی کے پاس؟''

''میں نہیں سمجھتی کہ اس کی کوئی ایسی سہیلی ہے''۔

''ممی پاپا کو فون کیا؟''

''نہیں''۔

''میں کروں؟''

''نہیں'' سشما نے آنسو ضبط کرتے ہوئے کہا۔

''غصے میں کوئی انتہائی اقدام نہ کر لے''۔

''وہ ایسا نہیں کر سکتی۔ میں جانتی ہوں اسے''۔

''پھر؟''

''ایک آدھ دن میں خود ہی پتہ چل جائے گا۔ ہم ڈھونڈیں گے نہیں''۔ سشما نے فیصلہ کن انداز میں کہا۔ سشما کی آنکھوں سے آنسو بہہ رہے تھے لیکن چہرے پر اطمینان تھا۔

پرندے ایک ایک کر کے پھر سے جاگ گئے اور جال سمیت اونچائی پر پرواز کرنے لگے۔

دَخمہ

سامنے سہراب کی نعش تھی اور اس کے پیچھے دو دو پارسی سفید لباس پہنے ہاتھ میں پیوند کا کنارہ پکڑے خاموشی سے چل رہے تھے۔ان کے پیچھے ہم لوگ تھے۔''دَخمہ'' کی گیٹ پر ہم لوگ رک گیے۔ہمیں اندر جانے کی اجازت نہیں تھی۔

میں نے ماحول کا جائزہ لیا۔سب کچھ ویسا ہی تھا۔کچھ بھی نہیں بدلا میری بہن کا گھر بھی!! لیکن اس گھر میں اب میرا کوئی نہیں رہتا تھا۔میری بہن اور بہنوائی کا انتقال ہوئے ایک عرصہ ہو چکا تھا۔میری بھانجی اسی شہر میں اپنے شوہر کے ساتھ رہتی تھی۔

اسکول کی چھٹیاں ہوتے ہی میں اپنی بہن کے پاس دوڑا چلا آتا۔وہ میری سب سے بڑی بہن تھیں درمیان میں چھ اور بہنیں اور ان کے بعد سب سے چھوٹا میں۔اکلوتا بھائی۔میری

بھانجی مجھ سے صرف دو برس چھوٹی تھی۔ ہم دونوں خوب کھیلا کرتے۔

وہ گھر مجھے بہت اچھا لگتا تھا۔ چٹان پر بنا ہوا خوب صورت مکان اسٹیشن کے اس پار۔ پلاننگ کے ساتھ بنائے ہوئے بنگلے۔ درمیان میں سیدھی تارکول کی سڑکیں۔ کافی چڑھاؤ اور اتار تھے۔ ایک زمانے میں اس جڑواں شہر میں صرف تانگے چلتے تھے۔ سائکل رکشاؤں کا داخلہ ممنوع تھا۔ میری بہن کے گھر پہنچتے پہنچتے گھوڑا ہانپنے لگتا۔ چڑھائی پر گھوڑے کے پیر جمتے نہ تھے۔ جب ہم تانگے سے اترنے لگتے تو تانگے والا خاص انداز میں توازن بنائے رکھتا۔ مشرقی جانب واٹر ریز روائر تھا۔ مغرب میں جہاں سڑک مسطح ہوجاتی ہے سینٹ فلومینا چرچ تھا۔ چرچ میں مشنری اسکول بھی تھا۔ کھلی ٹانگوں والے یونیفارم کے اسکول کو کم ہی مسلمان لڑکیاں جاتی تھیں۔ میری بھانجی بھی اسلامیہ اسکول میں پڑھتی تھی۔ لیکن ہم لوگوں نے چرچ کا چپہ چپہ دیکھا تھا۔ کیوں کہ بچوں کو کوئی نہیں روکتا تھا۔ اتوار کے دن اطراف کے کرسچن prayer کے لیے آجاتے فضا میں گھنٹے گونجنے لگتے تو بڑا اچھا لگتا۔ پتہ ہی نہیں چلتا کہ گھنٹے کون بجاتا ہے۔ مسجد کافی فاصلے پر تھی جہاں چھوٹے چھوٹے بے ترتیب مکان تھے۔

گھر کے مقابل اونچی چٹان بلکہ پہاڑ پر ایک دائرہ نما عمارت بنی ہوئی تھی۔ کئی ایکڑ پر پھیلا ہوا علاقہ تھا۔ بہت بڑی باؤنڈری تھی۔ نیچے بڑا سا گیٹ تھا۔ لوگ اس کو پارسی گُٹھہ کہتے تھے۔ احاطہ میں ایک چھوٹا سا مکان بنا ہوا تھا۔ جس میں چوکیدار، اس کی بیوی اور ایک کتا رہتے۔ عجیب سا پراسرار کتا!! محلے کے اکثر گھروں میں السیشن تھے یہ کتا ان سے مختلف تھا۔ دور سے ایسا لگتا جیسے اس کی چار آنکھیں ہوں۔

میری بہن پارسی گُٹھہ جانے سے منع کرتی تھیں۔ کہتی تھیں بچوں کو وہاں نہیں جانا چاہیے۔

ایک دن ہم نے دیکھا پارسی گٹھہ کا گیٹ کھلا چھوڑ دیا گیا ہے اور چوکیدار صاحب بے حد مصروف ہیں۔ ۱۱ بجے دھوپ میں سفید کپڑوں میں ملبوس دو دو پارسی ایک رومال کے دو مختلف سرے

پکڑے ہوئے ایک قطار میں چلے آ رہے ہیں۔ سب سے آگے دو پارسی تھے۔ درمیان میں ایک گاڑی۔۔۔ پھر پارسیوں کی قطار۔۔۔!! تقریباً ایک بجے تک وہ لوگ مصروف رہے پھر واپس ہوگئے۔ شام ہونے سے پہلے گدھوں کے جھنڈ آنا شروع ہوا۔ وہ سب اس دائرہ نما عمارت کے کنارے پر بیٹھ گئے۔ شام ہوتے ہوتے سارے گدھ اڑ گئے میں نے ایک ساتھ اتنے سارے گدھ پہلی بار دیکھے تھے شام تک وہ مصروف رہے۔

میں نے اپنی بہن سے پوچھا کہ ''اتنے گدھ اس عمارت پر کیوں جمع ہوگئے تھے؟'' بہن نے بتایا پارسی گٹھ اصل میں پارسیوں کا قبرستان ہے۔ پارسی مرنے والے کی نعش کو چھت پر رکھ دیتے ہیں تا کہ گدھ اس نعش کو نوچ کھائیں یہ سارے گدھ اسی لیے آئے تھے۔

''یہ کیسا طریقہ ہے آپی؟'' میں نے جھرجھری سی لے کر کہا۔

''بیٹا اپنا اپنا عقیدہ ہے۔ کوئی دفن کرتا ہے۔ کوئی جلا دیتا ہے یہ لوگ پرندوں کو کھلا دیتے ہیں اور اسی کو ثواب سمجھتے ہیں۔'' اندھیرا ہونے سے قبل سارے گدھ لوٹ گئے۔ اس کے باوجود ہم اس روز چھت پر نہیں سوئے۔ میں اور میری بھانجی دونوں ڈر کے مارے نیچے کمرے میں ہی سو گئے کیا پتہ کوئی گدھ ہمیں مردہ سمجھ کر۔۔۔۔

بیدار ہوتے ہی ہم دونوں پارسی گٹھ گئے۔ کتا ہمیں دیکھ کر بھونکنے لگا۔

''ارے بیٹا تم لوگ؟''

''چاچا کل کسی کا انتقال ہوا تھا؟''

''ہاں بیٹا''

''دو دو آدمی کیوں قطار بنا کر چلتے ہیں؟''

''یہی طریقہ ہے۔ تنہا کوئی نہیں چلتا۔''

''انہوں نے رومال کیوں پکڑ رکھا تھا؟''

''وہ رومال نہیں اسے پیوند کہتے ہیں''

''اور یہ گول عمارت؟''

''یہ دَخمہ'' ہے۔اس کی چھت درمیان سے اونچی ہوتی ہے چھت پر تین دائرے بنے ہیں۔مرد کی نعش بیرونی دائرے میں' عورت کی درمیانی دائرے میں اور بچوں کی نعش اندرونی دائرے میں رکھی جاتی ہے تا کہ ان پر تیز دھوپ پڑے اور گدھوں کو دور سے نظر آ جائے۔''

''چاچا یہ کُتا اتنا عجیب کیوں ہے؟'' میری بھانجی نے پوچھا

''اسے ''سگ دید'' کہتے ہیں۔چار آنکھوں والا کتا۔۔۔اس کی چار آنکھیں نہیں ہیں لیکن آنکھوں پر ایسے نشان ہیں جس سے اس کی چار آنکھیں نظر آتی ہیں۔یہ ''سگ دید'' ہی آدمی کے نیک و بد ہونے کا فیصلہ کرتا ہے۔''

''کیسے چاچا''

''جب بڑے ہو جاؤ گے تو خود ہی پتہ چل جائے گا'' چاچا نے ہمارے سوالات سے اکتا کر کہا

''اور چاچا یہ گدھ کہاں سے آ جاتے ہیں؟''

''اگر فرش پر چینی گر جائے تو چیونٹیاں کہاں سے آتی ہیں؟'' چاچا نے سوال کیا اور اندر چلے گئے۔اس روز بھی ہم چھت پر نہیں سوئے۔

(سہراب بھی ان تمام مراحل سے گزر رہا ہو گا۔)

(۲)

سہراب کا ''میکدہ'' شہر کے مصروف علاقے میں تھا۔ممکن ہے جس وقت اس کے اجداد نے ''مئے کدہ'' کھولا ہو گا یہ مصروف ترین علاقہ نہ رہا ہو۔کیوں کہ سامنے راجہ صاحب کی بہت بڑی حویلی تھی۔۔۔بغل میں بھی ایک بہت بڑی حویلی تھی۔۔۔دائیں جانب ڈراما تھیٹر تھا۔اور بائیں

جانب بہت آگے انگریزوں کی ریزیڈنسی تھی۔ مقابل میں ایک چھوٹی سی مسجد تھی مسجد سے لگ کر جو گلی تھی وہ ''مجرد گاہ'' تک جاتی تھی۔ مجرد گاہ ادیبوں' شاعروں اور فن کاروں کا میٹنگ پوائنٹ تھا۔ اس میں فائن آرٹس اکیڈمی بھی تھی اور رسالے کا دفتر بھی۔ ہم لوگ ادیبوں' شاعروں اور فن کاروں کو دیکھنے آجاتے تھے۔ ان دنوں بعض ادیبوں و شاعروں کی شہرت فلمی اداکاروں سے کم نہ تھی۔ بیچلر کوارٹرس کے مقابل ایک بڑا شراب خانہ بھی تھا جہاں سستی شراب فروخت ہوتی۔ اکثر فن کار وہاں چلے جاتے۔ جیب گرم ہوتی تو اکثر ادیب و شاعر مئے کدہ کا رخ کرتے شہر کا یہ سب سے قدیم شراب خانہ تھا!! ایک تو سہراب خالص شراب بیچتا تھا۔ دوسرے وہ ادیبوں و شاعروں کے مزاج سے اچھی طرح واقف بھی تھا۔ کسی اچھے شعر پر داد بھی دے دیا کرتا۔ پارسی ویسے بھی خوش اخلاق اور مہذب ہوتے ہیں۔ پھر سہراب صرف شراب اور سوڈے کی اصل قیمت لیتا تھا۔ پانی اور گلاس وہ خود فراہم کرتا۔ اندر ٹیبل اور کرسیاں بھی تھیں۔ گزگ کا کوئی انتظام نہ تھا۔ لڑکے ٹوکریوں میں گرین پیس' بھنی ہوئی مونگ پھلّی' چڑوا لیے گھومتے۔ لوگ حسبِ ضرورت ان سے چیزیں خرید لیتے۔ دوسرے بارس کے مقابلے میں ''مئے کدہ'' نسبتاً کم خرچ تھا۔

ہم نے جس وقت ''مئے کدہ'' جانا شروع کیا۔ شہر کئی انقلابات سے گزر چکا تھا۔ کمیونسٹوں کی شاہی کے خلاف جدوجہد' تلنگانہ تحریک کامیاب تو ہوئی لیکن شاہی کا خاتمہ کانگریس کی نئی حکومت نے کیا تھا۔ پولس ایکشن نے مسلمانوں کو حواس باختہ کر دیا تھا۔ مذہب کے نام پر ملک کی تقسیم سے پوری قوم سنبھلی بھی نہ تھی کہ زبان کی بنیاد پر ریاستوں کی نئی حد بندیاں کی گئیں۔ ریاست کے تین ٹکڑے کر دیے گئے۔ برسوں گزر جانے کے بعد بھی دوسری ریاستوں سے جڑے یہ ٹکڑے ان کا حصہ نہ بن سکے۔ اپنی مستحکم تہذیب کی بنیاد پر ریاست کے یہ حصّے ٹاٹ میں مخمل کے پیوند لگتے تھے۔ مذہب کے نام پر تقسیم کو عوام نے قبول نہیں کیا تو زبان کے نام پر ریاستوں کی نئی حد بندیوں کو بھی ایک ہی زبان بولنے والوں نے قبول نہیں کیا۔ دو مختلف کلچر۔!! جس شہر کی تاریخ نہیں ہوتی اس

کی تہذیب بھی نہیں ہوتی۔ نئے آنے والوں کی کوئی تاریخ تھی نہ تہذیب ایک مستحکم حکومت کا دارالخلافہ سیاسی جبر کی وجہ سے ان کے ہاتھوں میں آگیا۔ وہ پاگلوں کی طرح خالی زمینوں پر آباد ہوگئے۔ ایک طرف بڑی بڑی حویلیاں حصے بخرے کر کے فروخت کردی گئیں۔ زمین بیچنا یہاں کی تہذیب کے خلاف تھا۔ شرما شرمی میں قیمتی زمینیں کوڑیوں کے مول فروخت کردی گئیں۔ آنے والے زمینیں خرید خرید کر کروڑ پتی بن گئے۔ نئے علاقوں کو خوب ترقی دی۔

کسی کوٹھی میں صدر ٹپہ خانہ آگیا' کسی حویلی میں انجینیر نگ کا آفس' کسی حویلی میں اے۔ جی آفس تو کسی حویلی میں بڑا ہوٹل کھل گیا۔ باغات کی جگہ بازار نے لے لی۔ لیڈی حیدری کلب پر سرکاری قبضہ ہوگیا۔ کنگ کوٹھی کے ایک حصے میں سرکاری دواخانہ آگیا۔ جیل کی عمارت منہدم کر کے دواخانہ بنادیا گیا۔ رومن طرز کی بنی ہوئی تھیٹر میں اب بہت بڑا مال کھل گیا تھا۔ حویلیوں' باغات' جھیلوں اور پختہ سڑکوں کے شہر کی جگہ دوسرے عام شہروں جیسا شہر ابھر رہا تھا جس کی کوئی شناخت نہ تھی۔

چند برسوں میں سب کچھ بدل گیا۔ جو تہذیب کے نمائندے تھے جو تہذیب کو بچا سکتے تھے ان میں سے کچھ اپنی زمینوں کو چھوڑ کر سرحد کے اس پار جا بسے تھے اور کچھ مغربی ممالک میں آباد ہوگئے۔ ولی عہد نے ایک مغربی ملک کو اپنا مسکن بنالیا۔ رعایہ کی محبت کا یہ حال تھا کہ جب بھی وہ اس شہر کو آتے تو اس طرح خوشی سے پاگل ہونے لگتے تھے جیسے کوئی فاتح اپنی سلطنت کو لوٹا ہو۔ نہ شاہی خاندان کے افراد کو تہذیب کی فکر تھی۔ نہ امرا کو اور نہ عوام کو۔! ''مئے کدہ'' کے اطراف کا ماحول بھی تبدیل ہوگیا۔ راجہ جی کی حویلی میں سرکاری دواخانہ آگیا۔ سامنے کی کوٹھی میں بینک کا مین آفس' ریذیڈنسی میں ویمنس کالج' ڈراما تھیٹر فلمی تھیٹر میں تبدیل ہوگیا۔ شہر کا نقشہ تیزی سے بدلتا جارہا تھا۔ تیلگو فلم انڈسٹری مدراس سے یہاں منتقل ہوگئی تھی۔ شہر کی چمک دمک بڑھ گئی۔ فلمی اسٹیڈیوز' 70 ایم ایم تھیٹرز' بڑے بڑے مالس' کپڑوں اور زیورات کی دکانیں۔ سب ان کا تھا۔

سب پر ان کی چھاپ نمایاں ہو رہی تھی۔ان کی غذاوں کے ہوٹل آ گئے تھے جہاں متوسط طبقے کا آدمی پیٹ بھر کھانا کھا سکتا تھا۔''فُل مِیل'' (full meal) ملتا تھا۔وہ آخر میں بڑے انہاک کے ساتھ چاول میں دہی ملا کر کھانے لگتے تو اکثر دہی بہہ کر کہنیوں تک آ جاتا۔سڑکوں اور کالجس میں سانولے اور سیاہ فام لڑکے لڑکیوں کی تعداد بڑھتی جا رہی تھی۔بڑی بڑی کاجل بھری آنکھیں۔۔ نمکین چہرے۔۔پشت پر بلاوز دور تک کھلا ہوا۔۔۔پتہ نہیں انھیں پیٹھ کی نمائش کا شوق کیوں تھا؟ مقامی لوگ لینڈ گرابرس کی فروخت کی ہوئی خشک تالابوں کی زمین پر مکانات بنانے پر مجبور ہو گئے تھے۔ہر بارش قیامت بن کر آتی۔مسلسل فسادات نے پرانے شہر کی ساکھ کو بہت متاثر کیا تھا۔ ہفتوں کرفیو لگا رہتا۔ہر تہوار و عید پر لوگ سہم جاتے۔اس صورت حال سے تنگ آ کر جو پرانا شہر چھوڑ سکتے تھے۔وہ نئے علاقوں میں جا بسے۔ساری رونق' بڑی بڑی سڑکیں' فلائی اوور' ہائی ٹیک سٹی سب کچھ نئے شہر میں تھے۔تمام دفاتر نئے شہر کو منتقل کر دیے گئے تھے۔پرانے شہر میں کچھ تاریخی عمارتیں رہ گئی تھیں۔مشہور زمانہ چوڑیوں کا لاڈ بازار تھا۔پتھر سے تعمیر کی گئی مارکٹ پتھر گٹی تھی۔ عیدوں پر ساری رات یہ بازار جگمگایا کرتے۔دو تہذیبوں نے الگ الگ جزیرے بنا لیے تھے۔ جب بھی ریاست کے مقامی افراد کو محرومی کا احساس بہت ستاتا تو وہ علیحدہ ریاست کا مطالبہ کرنے لگتے۔الیکشن کے زمانے میں کوئی باغی لیڈر اس مسئلے کو گرما دیتا۔کچھ مہینوں خوب ہماہمی رہتی پھر جذبات سرد پڑ جاتے۔

''مئے کدہ'' کا علاقہ بھی اب ڈاون ٹاون بنتا جا رہا تھا۔پرانے شہر سے نئے علاقے کو منتقل ہونے والوں میں خود میں بھی شامل تھا۔(''دَخمہ'' میں پارسی ابھی تک مصروف تھے۔کوئی باہر نہیں آیا تھا۔)

ان دنوں ادیبوں کا کوئی میٹنگ پوائنٹ نہیں تھا۔سب بکھر گئے تھے۔ہمارے دور کو انتشار کا عہد مان لیا گیا تھا۔فرد کو مشین قرار دے دیا گیا تھا اور تنہائی کو ہمارا مقدر۔!! یہ تسلیم کر لیا گیا

تھا کہ تاریخی، تہذیبی، قومی، معاشرتی، جذباتی و ذہنی ہم آہنگی کی ساری روایتیں منہدم ہو چکی ہیں۔ پورا ادب درونِ ذات کے کرب میں مبتلا تھا۔اس لیے اب ضروری نہیں تھا کہ سب کسی ایک ہی بار یا ہوٹل میں ملیں۔شہر بہت پھیل گیا تھا۔جگہ جگہ وائن شاپس کھل گئے تھے۔ہم کسی دوست کے گھر جمع ہو جاتے۔کسی قریبی دکان سے شراب منگوالی جاتی۔فون کرنے پر ہوٹل سے ''گزگ'' بھی پہنچ جاتی ۔ہوم ڈیلیوری کا رواج ہو گیا تھا۔اب ''مئے کدہ'' جانا ہی نہیں ہوتا تھا۔

لیکن وہ کیوں سوچ رہا ہے شہر کی تہذیب کے بارے میں شہر کے بارے میں؟ شاید اس لیے کہ ''مئے کدہ'' کو بند دیکھ کر اسے بڑا شاک لگا تھا۔جیسے تہذیب کا ایک حصہ مر گیا ہو۔

میرا دوست مشیر جو بہتر زندگی کا خواب آنکھوں میں سجائے امریکہ منتقل ہو گیا تھا۔ بیس برس بعد امریکہ سے آیا۔اپنا شہر چھوڑ کر باہر بس جانے والے ایک تو ناسٹالجک ہو جاتے ہیں دوسرے چیارٹی کرنے کے لیے اتاولے ہوتے ہیں۔وہ ایسی ہر جگہ جانا چاہتا تھا جہاں بیس برس قبل ہم جایا کرتے تھے۔ہر جگہ ساتھ چلتا بہت چیزوں کی تبدیلی پر اداس ہو جاتا۔ظاہر ہے شہر بہت تیزی سے بدلا تھا اور اس پر گلوبلائزیشن کی پرچھائیاں صاف نظر آرہی تھیں۔اسے اس لیے بھی مایوسی ہو رہی تھی کہ جو چیزیں وہاں ترقی یافتہ شکل میں دیکھ کر آیا ہے یہاں اسی کی نقل کی جارہی ہے۔ شہروں کی شناخت تیزی سے ختم ہو رہی ہے۔سب شہر ایک جیسے ہو رہے ہیں۔مجھے یاد آیا کہ پرانی باقیات میں صرف ''مئے کدہ'' بچا ہے جس میں کوئی تبدیلی نہیں آئی۔وہی عمارت، وہی انتظام، ویسے ہی کاونٹر، وہی مستقل گاہک۔۔۔جو بوتل خرید کر حسب ضرورت پیتے ہیں اور بچی ہوئی شراب کی بوتل محفوظ کروا دیتے ہیں۔اس بوتل سے ایک قطرہ بھی کم نہ ہوتا۔۔دیانت داری ''مئے کدہ'' کی سب سے بڑی خوبی تھی۔مستقل گاہکوں کو یہاں بڑی اپنائیت محسوس ہوتی تھی۔مشیر کے یہاں رہنے تک ہم روزانہ ''مئے کدہ'' جایا کرتے تھے۔ایک خاص وقت تک شغل کرتے پھر اپنی راہ لیتے۔پتہ نہیں مشیر کو مئے کدہ کی یاد کیوں نہیں آئی۔امریکہ سے آنے کے بعد اس نے ایک بار بھی

شراب کا نام نہیں لیا تھا۔ میں نے اس سے کہا کہ اسے ایک ایسی جگہ لے چلوں گا جو بالکل نہیں بدلی ۔دوسرے روز میں اسے ''مئے کدہ'' لے آیا۔

لیکن ''مئے کدہ'' بند تھا۔ برسوں پہلے ''مئے کدہ'' کی پیشانی پر ابھرے ہوئے لفظوں میں MAI KADA EST: 1904 اسی طرح موجود تھا نیچے اردو میں بھی ''مئے کدہ'' لکھا تھا ۔آس پاس دریافت کیا تو پتہ چلا کافی دنوں سے بند ہے۔ مجھے بڑا شاک لگا۔ اپنی بے خبری پر افسوس بھی ہوا۔ پتہ نہیں یہ سب کب اور کیسے ہوا؟ ایسا محسوس ہوا جیسے تہذیب کا ایک حصہ مر گیا ہو۔

پتہ نہیں سہراب کی صحت کیسی ہے؟ کاروبار میں نقصان تو نہیں ہوا؟ کسی ناگہانی مصیبت میں تو نہیں پھنس گیا؟

ہم لوگوں نے سہراب کے گھر کا پتہ چلایا۔ اس کے گھر پہنچے۔قدیم پارسی طرز کا مکان تھا۔ ملازم نے ڈرائنگ روم میں بٹھایا۔ ہم دیوار پر ٹنگی تصویریں دیکھنے لگے۔ سہراب نے انتظار نہیں کروایا۔

''آپ'' وہ مجھے دیکھ کر چونک پڑا

''ہاں۔اور انھیں پہچانا۔ مشیر!!''

''اوہ یاد آیا۔ آپ تو پورے انگریز ہو گئے۔''

''امریکہ میں جو رہتا ہے۔'' میں نے ہنس کر کہا

''آپ تو یہیں رہتے ہیں نا؟'' اس نے ہنس کر کہا

مجھے شرمندگی ہوئی۔

کہیے کیا لیں گے؟

''نہیں میں دن میں نہیں لیتا'' میں نے کہا ''اور مشیر تم؟''

''نہیں میں بھی نہیں لوں گا''

''کوئی تکلّف نہیں۔'' اس نے ملازم سے کچھ کہا۔'' آپ لوگوں کو دیکھنے آنکھیں ترس گئیں''

''میں شرمندہ ہوں۔''

''ہاں شہر بھی تو بہت پھیل گیا ہے۔''

''آپ کی صحت کیسی ہے۔''

''اچھا ہوں۔''

''بزنس میں نقصان ہوا؟'' میں نے راست پوچھ لیا

''نہیں۔''

''پھر مئے کدہ''۔؟''

''چھوڑیے کوئی کب تک بزنس کرتا رہے۔آدمی کو آرام بھی کرنا چاہیے نا۔!''

اتنے میں ملازم ٹرے سجا کر لے آیا۔

''خاص فرانسیسی شراب ہے۔اتنے دن بعد ملے ہیں' انکار نہ کیجیے''

ہم لوگ انکار نہ کر سکے۔واقعی بڑی نفیس شراب تھی۔دھیرے دھیرے سرور آنے لگا۔

''آپ بتایے'' مشیر سے مخاطب ہو کر اس نے کہا'' امریکہ میں کیسی گزر رہی ہے؟''

''پہلے جیسا تو نہیں ہے۔یہاں کی گھٹن سے بھاگے کچھ دن تو اچھا لگا اب فضا پر حبس چھایا ہوا ہے۔شک کے سائے میں زندگی گزارنا کتنا مشکل ہو جاتا ہے۔اس کا تجربہ پہلے کبھی نہیں ہوا تھا۔''

''سارا منظر نامہ ہی بدل گیا۔'' میں نے کہا'' وطن کے لیے جدو جہد' بین الاقوامی فیصلوں کی جارحانہ خلاف ورزیاں' دہشت گردی سب گڈ مڈ ہو گئے ہیں۔ایک پوری قوم کو دہشت گردی کے جال میں پھنسا دیا گیا۔ایک آگ سی لگی ہوئی ہے جس میں پتہ نہیں کون کون ہاتھ سینک رہا ہے

۔لیکن ملزم تیار ہے جرم کہیں بھی کسی نے کیا ہو۔نشان زدہ ملزمین تیار ہیں ۔پولیس نے بھی ظلم کے سارے حربے آزمالیے ۔عدالتیں کبھی چھوڑتیں ہیں کبھی نہیں چھوڑتیں۔اور بے وقوف قوم دلدل میں دھنستی ہی جارہی ہے۔''

''آپ تو جذباتی ہوگئے ۔تاریخ اپنے رنگ بدلتی رہتی ہے ۔دیکھیے نا ایران سے مسلمانوں نے ہم کو باہر کیا تھا۔اسپین میں مسلمانوں کو باہر کیا گیا۔اس ریاست کو ہم آصف جاہی سلطنت کے چرچے سن کر آئے تھے۔ہمارے اجداد کو سالار جنگ اول نے مدعو کیا تھا۔انتظامیہ میں ہمیں شامل کیا گیا۔میر محبوب علی خان نے ہمیں خطابات سے نوازا تھا۔نواب سہراب نواز جنگ‘ فرام جی جنگ‘ فریدون الملک وغیرہ وغیرہ فارسی یہاں کی سرکاری زبان تھی اور اردو عوامی زبان ۔ بریانی‘ نوابوں اور موتیوں کا شہر۔!! گجراتی ‘مارواڑی‘ سندھی سبھی آبسے تھے۔سب کو آزادی حاصل تھی سب نے اپنی اپنی عبادت گاہیں تعمیر کرلیں۔شاہی خزانے سے مدد بھی ملتی تھی ۔ہمارے لیے تو بہت سازگار ماحول تھا۔بڑا عجیب معاشرہ تھا۔'' اس نے ہنستے ہوئے کہا '' آپ کو یاد ہے؟ نہیں آپ تو بہت چھوٹے رہے ہوں گے۔تھیٹر میں جب ہم فلم دیکھنے جاتے تو درمیان میں ایک سلائیڈ دکھائی جاتی۔''وقفہ برائے نماز''لوگ جلدی جلدی فرض نماز پڑھ کر تھیٹر لوٹ آتے۔رند کے رند رہے ہاتھ سے جنت نہ گئی والا معاملہ تھا۔''

''آپ کو شاہی دور پسند تھا؟''

''نہیں رواداری پسند تھی ۔معاشرے کا کھلا پن اچھا لگتا تھا۔اب تو کٹر پن آ گیا ہے ہر قوم میں۔!''

''ہاں مسلمان بھی خدا حافظ کی جگہ اللہ حافظ اور نماز کے بجائے صلوٰۃ کہہ کر بہت خوش ہونے لگے ہیں'' میں نے کہا۔

''مئے کدہ'' آپ نے کیوں بند کردیا؟'' مشیر نے اچانک پوچھا۔

''ارے ہاں میں تو اصل بات ہی بھول گیا'' میں نے چونک کر کہا۔

''چھوڑ یئے۔''

''نہیں بتایئے نا کیا ہوا تھا؟'' میں نے اصرار کیا۔ کافی دیر تک وہ خاموش رہا۔ پھر دھیرے سے کہا

''مسلمانوں نے حکومت سے شکایت کی کہ ''مئے کدہ'' مسجد سے بہت قریب ہے جو خلاف قانون ہے'' میں سناٹے میں آ گیا۔ تو یہ مسلمانوں کا کارنامہ ہے۔ میں نے سوچا۔

''لیکن مسجد اور مئے کدہ برسوں سے اسی جگہ ہیں پھر؟''

''وہ شاہی دور تھا۔ اب جمہوریت ہے۔!! مسلمان اس ملک کی سب سے بڑی اقلیت ہیں۔ اس کا خیال رکھنا حکومت کا فرض بھی تو ہے۔''

''مسلمان بھی بہت کٹّر ہوتے جا رہے ہیں'' مشیر نے کہا۔ نشہ چڑھنے لگا تو ہم کٹّر مسلمانوں کو نوازنے لگے۔

''مسلمان ہی کیوں'' سہراب نے ہمیں روکا سب کا یہی حال ہے خود مجھے دیکھیے۔ میں نے شادی نہیں کی کیوں کہ پارسی غیر مذہب میں شادی نہیں کر سکتے۔ اس مذہبی شرط کی وجہ سے ہماری تعداد گھٹتی جا رہی ہے۔ اکثر تاخیر سے شادی کرتے ہیں یا نہیں کرتے۔ اب پورے شہر میں بارہ سو پارسی رہ گئے ہیں۔''

''واقعی؟''

''ہاں دوسرا مسئلہ موت کا ہے۔ وہی پرانا دَخمہ۔ برہنہ نعش کو جلتی دھوپ میں چھوڑ دیتے ہیں۔ اب تقریباً بیس برس سے گدھوں نے شہر کا رخ کرنا چھوڑ دیا ہے۔ اب مختلف الخیال گروپ بن گئے ہیں کوئی کہتا ہے نعش کو دفن کر دینا چاہیے۔ کوئی جلانے کے حق میں ہے۔ الکٹرک بھٹی کے بارے میں بھی غور کیا جا رہا ہے۔ کچھ لوگ گِدھوں کی Artificial Incimination کے

خطوط پر افزائش کے بارے میں سوچ رہے ہیں۔ میں تو پرانے طریقے کو ترجیح دوں گا کہتے ہیں کوئی نیک آدمی مرتا ہے تو گدھ آتے ہیں۔ پتہ نہیں ہمارا کیا حشر ہوگا۔!! آپ کے عقیدے کے مطابق شراب بیچنے والا جہنمی ہوتا ہے نا؟'' اس نے ٹھنڈی سانس بھری۔

''ہاں۔۔۔اور شراب پینے والا بھی۔اللہ معاف کرے۔!'' میں نے کہا۔

ملازم نے آکر اطلاع دی کہ کھانا تیار ہے۔

''آپ نے تکلف کیوں کیا۔اتنی اچھی شراب پینے کے بعد کھانے کی بالکل اشتہا نہیں ہے۔''

''پارسی ڈشس بنوائی ہیں آپ کے لیے۔۔۔''

ہم کھانے کی میز پر آگئے۔زندگی میں پہلی بار پارسی ڈشس کھانے کا اتفاق ہو رہا تھا۔ اس لیے بھی زیادہ انکار نہ کر سکے۔

''یہ براون رائس ہے۔یہ دَھن سَک یہ ساس اِن مچھی اور یہ کچومر سلاد''

براون رائس باسمتی چاول کی عمدہ ڈش تھی جس میں چینی اور کالی مرچ شامل تھی۔دَھن سَک تور کی دال' مونگ کی دال اور اڑت کی دال' انڈے' ٹماٹر اور کھیرے سے بنائی گئی ڈش تھی۔ ساس اِن مچھی میں بہترین پمفرٹ تھی ساتھ میں کرارے چکن پارچہ بھی تھے۔کھانا واقعی لذیذ تھا۔ آخر میں موامی بوئی نام کا مچھلی کا میٹھا پیش کیا گیا۔ہم نے بہت سیر ہو کر کھایا۔سہراب کی مہمان نوازی نے ہمیں بہت متاثر کیا۔

اور آج اطلاع ملی کہ سہراب مر گیا۔

مجھے بار بار یہی خیال آتا تھا کہ ''مئے کدہ'' کے بند ہو جانے کا اس پر بہت اثر ہوا ہوگا۔ اس لیے شاید وہ زیادہ جی نہ سکا ہو۔ میں Guilty محسوس کر رہا تھا۔اس کا اپنا کوئی نہ تھا۔دور کے رشتے دار اور چند احباب تھے۔

پارسی باہر آرہے تھے۔ سہراب کی برہنہ نعش کو دَخمہ کی چھت پر چھوڑ دیا گیا ہوگا۔ میں بار بار آسمان کی طرف دیکھنے لگا۔ بہت سے پارسی بھی رک گئے تھے۔ اگر گدھ نہ آئیں تو؟ کیا سہراب کی نعش دھوپ میں سوکھتی رہے گی؟ کاش سہراب نے الکٹرک بھٹی کو ترجیح دی ہوتی میں سوچ رہا تھا۔

میں نے غیر ارادی طور پر آسمان کی طرف دیکھا۔ مجھے بچپن کا وہ منظر دوبارہ نظر آنے لگا۔ گِدھوں کا ایک جھنڈ تیزی سے دَخمہ کی طرف آرہا تھا۔

پارسیوں کے چہرے خوشی سے کھل اٹھے۔ بیس برس بعد یہ منظر لوٹا تھا۔

''پتہ نہیں کہاں سے آئے ہیں؟'' وہ ایک دوسرے سے سوال کر رہے تھے۔

''اگر فرش پر چینی گر جائے تو چیونٹیاں کہاں سے آتی ہیں؟'' کوئی میرے کان میں پھسپھسایا۔

☆☆☆

نمی دانم کہ ....

شہر کے اس علاقے میں آنے سے وہ گریز کرتا تھا۔ کافی بھیڑ ہوتی تھی۔ اکثر ٹریفک جام ہو جاتا، سواریاں رینگنے لگتیں۔ شہر کا مرکزی ریلوے اسٹیشن بھی اسی علاقے میں تھا۔ اسٹیشن پر تو ''حیدرآباد'' کے بورڈ لگے تھے لیکن وہ ''نام پلی'' کہلاتا تھا۔ اکثر باہر سے آنے والے کنفیوز ہو جاتے۔ ایک بار ابا کے دوست نے تمسخرانہ انداز میں پوچھا یہ کیا نام ہوا ''نام پلی'' ....!!

''یہ نام ہماری ملی جلی تہذیب کی علامت ہے'' ابا نے سنجیدگی سے ایک ایک لفظ پر زور دے کر کہا تھا۔ ''عبداللہ قطب شاہ کے دیوان سلطنت رضا قلی کا خطاب ''نیک نام خاں'' تھا۔ یہ علاقہ ان کی جاگیر تھا۔ عوام نے ان کے خطاب سے ''نام'' لیا اور تلگو کا لفظ پلّی جوڑ دیا۔ ''نام پلی'' ....!! شہر میں ایسے کئی محلے ہیں۔ تاریخی شہروں کا اپنا ایک الگ کردار ہوتا ہے'' ابا

کے دوست کھسیانے ہوگئے تھے انھوں نے سوچا بھی نہ ہوگا کہ ابّا اتنا سنجیدہ ہو جائیں گے۔ ''سرکار چاہے کسی نام کے بورڈ لگا دے عوامی نام نہیں بدلتے...''

سہ راہے سے وہ درگاہ کے راستے پر مڑ گیا۔ بے پناہ ہجوم تھا۔ دونوں جانب لاج تھے۔ معمولی درجے کی ہوٹلیں، چائے کے علاوہ لقمی کباب، سموسے، عثمانیہ بسکٹ، چاول کے ساتھ دال فری ملتی تھی۔ دوسری جانب آٹو رکشا کے ریپیرنگ سینٹر تھے یہاں ڈینٹنگ کی جاتی تھی۔ نمبر پلیٹیں بنائی جاتیں۔ اکثر ڈرائیور آٹو کے عقبی حصے پر اپنے ذوق کا کوئی شعر لکھوا لیتے۔ کچھ ''ماں کی دعا'' پر ہی اکتفا کر لیتے۔ اندرونی حصے میں دونوں جانب اداکاروں واداکاراؤں کی تصویری لگوائی جاتیں۔

وہ اسکوٹر سے اتر گیا اور اسکوٹر کا ہینڈل تھامے پیدل چلنے لگا۔ سامنے درگاہ کا باب الداخلہ تھا۔ اس نے اسکوٹر حفاظت میں رکھوا دیا۔ ایک ہجوم تھا۔ جمعرات کا دن تھا۔ درگاہ کے احاطے میں قدم رکھتے ہی وہاں بیٹھے فقیر آوازیں لگانے لگے'' جوتا یہاں چھوڑ کے جاؤ صاب''.......اس نے جوتے بھی رکھوا دیے۔ فرش پر ننگے پیر چلنے میں بڑا تکلف ہو رہا تھا۔ بڑا گندہ فرش تھا۔ اس کی نفاست پسند طبیعت پر بہت بار گزر رہا تھا۔ آگے بڑھتے ہی ایک شور بلند ہوا۔ ''صاب پھول چاہیے......؟ ہر دکان دار اسے اپنی طرف ہلا رہا تھا۔ وہ گھبرا گیا۔ ''مجھے حضت قبلہ سے ملنا ہے'' اس نے ایک شخص سے کہا۔ اس نے عجیب نظروں سے اس کی طرف دیکھا۔ ''انوں تو مغرب کے بادچ ملیں گے، آپ پہلے پھولاں چڑھا کے آیئے'' اس نے اس کے ہاتھوں میں پورا پیکیج تھما دیا۔ اگر بتیاں، نقل کا پیکٹ، پھولوں کی چادر......! جتنے پیسے اس شخص نے مانگے اس نے دے دیئے۔ مزار کے اطراف کافی لوگ تھے۔ ہر مذہب کے افراد تھے۔ پورا احاطہ عود اور لوبان کی خوشبو سے مہک رہا تھا۔ مزار کے قریب کھڑے باریش آدمی نے وہ ساری چیزیں لے لیں۔ مزار پر چادر چڑھا دی، اگر بتیاں سلگا دیں وہ ایک طرف چپ چاپ کھڑا رہا۔ کچھ لوگ بڑی عقیدت سے فاتحہ پڑھ رہے تھے کچھ لوگ مزار کا غلاف ذرا سا ہٹا کر ماتھا ٹیک رہے

تھے۔اس نے دعا کے لیے ہاتھ اٹھا دیئے آنکھیں موند لیں۔

''مجھے مکان واپس دلوا دیجئے'' یہی ایک جملہ وہ بار بار دہرانے لگا....... قریب سے اذان کی آواز آئی۔اس نے آنکھیں کھولیں۔'تبرک لے لو میاں' باریش آدمی نے نُقل کا کھلا ہوا پیکٹ اور پھول کی پتیاں اسے پکڑا دیں۔وہ جلدی سے باہر آ گیا۔اذاں کی آواز سن کر وہ سارا ہجوم مسجد میں سمٹ آئے گا اس نے سوچا اور تیزی سے مسجد میں داخل ہو گیا۔ادھر اُدھر سے کچھ لوگ آ گئے۔تین چار صفیں بنیں۔مزار کے اطراف بے پناہ ہجوم تھا۔خود اس نے کتنے عرصہ بعد با جماعت نماز پڑھی تھی اسے یاد بھی نہیں تھا۔نماز کے بعد اس نے وہی دعا دہرائی'' وہ مکان واپس دلوا دیجئے، میرے پروردگار۔تو دلوں کا حال جانتا ہے۔مالک۔''اس نے گڑگڑا کر دعا کی......جب مسجد سے سب نکل گئے تو اس نے ایک شخص سے پوچھا'' حضرت قبلہ کہاں ہیں؟اس نے ایک طرف اشارہ کیا۔ایک اونچا چبوترا تھا۔وہاں کچھ فقیر دائرہ بنائے بیٹھے تھے۔چلم کے کش لگا رہے تھے۔ان ہی میں حضرت قبلہ بھی تھے۔نورانی چہرہ، نیم وا آنکھیں، لمبی داڑھی، کندھوں تک بالوں کی لٹیں پھیلی ہوئی تھیں۔وہ قریب سے انھیں دیکھنے لگا۔

الکلّ فی الکلّ.......ولایت عبارت از فنا و بقا است''

وہ دھیرے دھیرے کہہ رہے تھے۔وہ سب کسی ذکر میں مصروف تھے۔حضرت قبلہ نے ایک لمبا کش بھرا......اچانک اٹھ کھڑے ہوئے۔فقیروں میں سے کوئی نہیں اٹھا۔ایک طرف تیز قدموں سے چلنے لگے جہاں قوالی ہو رہی تھی۔قوال عجیب کیفیت میں یہ شعر بار بار دہرا رہا تھا۔

نمی دانم کہ آخر چوں دم دیدار می رقصم
مگر نازم بہ اِس شوقے کہ پیشِ یار می رقصم

قوالی سننے والوں نے ان کے لیے راستہ بنایا۔وہ اگلی صف میں قوالوں کے روبرو بیٹھ گئے۔قوالوں نے ادب سے سلام کیا۔محفل میں جان پڑ گئی۔قوالی سننے والوں میں سے کسی پر وجد کی

کیفیت طاری ہو جاتی وہ جھومنے لگتا۔ حضرت قبلہ کا ہاتھ چھوا کر قوالوں کو نذرانہ پیش کیا جا رہا تھا۔ وہ وہیں بیٹھ کر حضرت قبلہ کے اٹھنے کا انتظار کرنے لگا۔ کافی رات تک قوالی چلتی رہی۔ حضرت قبلہ اٹھے تو ان کے پیچھے مریدوں کا حلقہ بھی چلا۔ وہ تیز قدموں سے چلتے ہوئے اپنے مکان میں چلے گئے۔ وہ منھ دیکھتا رہ گیا۔

(۲)

ذہن پر عجیب سے اثرات تھے۔ ایک کھوئی کھوئی سی کیفیت تھی۔

بیوی نے دروازہ کھولا۔ ''بہت دیر کر دی''

''وہاں'' اس کا موڈ دیکھ کر بیوی نے کچھ نہ کہا۔

''کھانا کھائیں گے؟''

''ہاں'' اس نے تبرک کا پیکٹ میز پر رکھ دیا۔ بیوی کھانا گرم کرنے چلی گئی۔

منھ ہاتھ دھو کر وہ ڈائننگ ٹیبل پر آ گیا۔

''کیا ہوا۔ ملاقات ہوئی'' اس کی ماں نے سوال کیا۔

''نہیں۔ بڑا عجیب ماحول ہے۔ کبھی کسی درگاہ پر حاضری نہیں دی نا۔''

اس نے ماں کو ایک ایک تفصیل بتائی۔ وہ بڑی توجہ اور عقیدت سے سنتی رہیں۔

''اس طرح ان سے ملنا تو مشکل ہے۔ تم ان کے خاص مریدوں کے ذریعے پہنچو۔'' امی نے مشورہ دیا۔ امی سیدانی تھیں۔ نانا بہت بڑے عالمِ دین تھے۔ امی کو سیدانی ہونے پر ناز تھا اور ابا کو مغل ہونے پر...... اونچا قد، اونچی آواز، نسبتاً بھدّی ناک، شخصیت میں ایک دبدبہ تھا۔ وہ کہتے تھے ان کے آبا و اجداد اورنگ زیب کی فوج کے ساتھ دکن آئے تھے۔ امی کی چہرے پر ایک نرمی تھی۔ لیکن نہ تو اس کا قد بہت اونچا تھا اور نہ آواز بھاری...... پھر بھی دکن کے سانولے لوگوں سے وہ الگ لگتا تھا۔ لیکن اس نے خود کو کبھی مقامی لوگوں سے برتر نہیں سمجھا اور نہ ابا کی طرح تیموری نسل

سے ہونے پر فخر کیا۔اب تو ''بابر کی اولاد'' ایک گالی بن گئی ہے۔تانا شاہ جیسے خدا ترس، نفیس، بادشاہ سے منسوب لفظ تانا شاہی منفی معنی میں استعمال ہونے لگا ہے۔مسخ شدہ تاریخ لفظوں کو کیسے بے حرمت کردیتی ہے۔اس نے سوچا۔

''بیٹا مایوس نہیں ہوتے'' امی نے اسے سوچ میں غرق دیکھ کر کہا، کوئی نہ کوئی صورت نکل آئے گی۔

کھانے کے بعد وہ لیٹ گیا۔

کیا ہوا؟ اس کی بیوی نے پوچھا

''ملاقات نہیں ہو پائی۔بڑا عجیب ماحول ہے''

''پھر کیا سوچا؟''

''اگلی جمعرات دوبارہ جاؤں گا''

''یعنی ایک ہفتہ بعد؟ کل ہی کیوں نہیں چلے جاتے؟''

''دیکھوں گا..... '' اس نے اکتائے ہوئے لہجے میں کہا۔اس کی بیوی کو ہر کام کی جلدی ہوتی تھی۔اس کی آنکھوں سے نیند اُڑ گئی۔اس نے کبھی کچھ پانے کے جدو جہد نہیں کی تھی۔زندگی میں جو بھی مل گیا اسی پر قناعت کر لی۔ابھی اس نے میٹرک ہی پاس کیا تھا کہ ابا کا اچانک انتقال ہو گیا۔ابا پروفیسر تھے۔بہت بڑا کوارٹر تھا اپنا ذاتی مکان کرائے پر اٹھا کر وہ یونیورسٹی کوارٹرز میں آگئے تھے۔ابا کی موت کے بعد اسے ملازمت دی گئی۔اپنی تعلیمی قابلیت کی بنیاد پر وہ کلرک بن گیا۔وہ بڑے کوارٹر سے چھوٹے کوارٹر میں آگئے۔اس بنگلے کے بڑے سے صحن میں امی نے امرود، آم، انار اور لیمو کے پیڑ لگائے تھے۔ہر موسم میں ترکاریاں بھی اگاتیں۔گلاب کی کیاریاں چمیلی اور جوہی کی بیلیں بھی تھیں۔اس چھوٹے سے کوارٹر میں امی نے ایک پودا بھی نہیں لگایا۔سب کچھ بدل گیا۔لوگوں کی نظریں، معیار زندگی، دوست، رشتہ دار، ملنے جلنے والے۔زندگی میں کوئی رومانس نہیں،

مستقبل سنوارنے کا کوئی بڑا خواب نہیں۔ امی نے شادی کر دی۔ اپنی بیوی سے اسے کوئی شکایت نہیں تھی۔ اچھی لگتی تھی وہ۔ شادی کے ایک برس بعد ایک لڑکا...... دوسرے برس ایک لڑکی...... قدرت نے خود ہی فیملی پلاننگ کر دی۔ بچوں کی بہتر پڑھائی کے لیے بڑے اسکولوں کے چکر نہیں کاٹے۔ ڈونیشن کے لیے قرض نہیں لیا۔ یونیورسٹی کے اسکول میں داخلہ دلوایا جس نے جیسا پڑھ لیا پڑھ لیا۔ لڑکی نے انٹر پاس کیا تو امی نے کہا کہ اس کی شادی کر دی جائے۔ لڑکی خوب صورت تھی۔ ایک خوش حال گھرانے کے انجینئر سے شادی ہوگئی۔ اپنے میاں کے ساتھ خوش تھی۔ لڑکے نے گریجویشن کے بعد خلیجی ملک جانے کی خواہش کی۔ پروویڈنٹ فنڈ سے قرض لے کر اسے بھیج دیا۔ ملازمت ملنے کے بعد اس کی بھی شادی کر دی۔ وہ اپنی بیوی کے ساتھ وہیں رہتا تھا۔ شاید بچت نہیں ہوتی تھی اس لیے وہ پیسہ بھی نہیں بھیجتا تھا۔ اس نے کبھی مطالبہ بھی نہیں کیا۔ کبھی اس کی بیوی اپنے بیٹے سے کاسمٹکس اور دوسری چیزیں منگوا کر وہ ارمان پورے کر لیتی جو وہ جوانی میں نہ کر سکی تھی۔ آج کل باقاعدگی سے بیوٹی پارلر بھی جانے لگی تھی۔ زندگی کے مراحل آسانی سے طے ہو گئے کوئی بڑا مسئلہ، کوئی سنگین بیماری، کوئی اڈونچر، کوئی بڑا خواب کچھ نہ تھا۔ زندگی جس حال میں ملی اس نے قبول کر لی۔

اب ایک پے چیدہ مسئلہ سامنے تھا۔ اگلے برس اس کا ریٹائرمنٹ تھا۔ اب یونیورسٹی کوارٹر چھوڑ کر شہر میں رہنا پڑے گا۔ آبائی مکان پر کرایہ دار قابض تھا۔ ابا نے وہ مکان کرائے پر اٹھایا تھا۔ اب ان کی دوسری یا تیسری نسل اس گھر میں تھی۔ ابا کی زندگی میں تو وہ لوگ قانون کے مطابق کرائے میں اضافہ بھی کرتے رہے اور کرایہ بھی پہنچاتے رہے۔ لیکن ادھر چند برسوں سے انھوں نے کرایہ بڑھانا چھوڑ دیا۔ مکان خالی کرنے کے لیے کہا گیا تو وہ ہٹ دھرمی پر اتر آئے۔ کرایہ دینا بند کر دیا۔ اس نے اپنے ہر دوست سے مشورہ کیا۔ ایک طریقہ تو یہ تھا کہ وہ کیس کر دیتا۔ لیکن برسوں مقدمہ چلتا۔ پیسہ بھی کافی خرچ ہوتا۔ غنڈوں سے کام لیا جا سکتا تھا۔ لیکن غنڈے بھی

سمجھوتے کے نام پر کافی پیسہ اینٹھ لیتے یا اسے کمزور دیکھ کر خود قابض ہو جاتے، یا وقت بے وقت پیسوں کا مطالبہ کرنے لگتے۔ سیاست دانوں کا اثر رسوخ استعمال کیا جا سکتا تھا لیکن وہ تو غنڈوں سے بھی زیادہ خطرناک ہوتے ہیں۔ کئی بار اس نے کرایہ داروں کو سنجیدگی سے سمجھانے کی کوشش کی۔ وہ کہتے تھے کہ وہ خود ہی مکان خرید لیں گے لیکن قیمت وہ نہیں دینا چاہتے تھے جو مارکٹ کی قیمت ہے۔اس کی سمجھ میں کچھ نہیں آ رہا تھا جیسے جیسے وظیفے کے دن قریب آتے جا رہے تھے پریشانی بڑھتی جا رہی تھی۔ شہر میں کرائے کا گھر لینا اور اس کا کرایہ ادا کرتے ہوئے زندگی گزارنا مشکل تھا۔ اپنے ذاتی مکان کا حصول زندگی کا سب سے بڑا مسئلہ بن کر سامنے آئے گا اس نے کبھی سوچا نہ تھا......اس کا ڈپریشن بڑھتا جا رہا تھا۔ کبھی اسے محسوس ہوتا جسے وہ اپنا ذہنی توازن کھو دے گا۔

کسی نے اسے بتایا کہ اس کا کرایہ دار اس درگاہ کے مرشد کا بہت بڑا معتقد ہے۔اس نے سوچا وہ حضرت قبلہ کے سامنے مسئلہ رکھے گا ممکن ہے وہ ان کی بات مان لے۔ لیکن آج کا ماحول دیکھ کر وہ گھبرا گیا۔ حضرت قبلہ سے ملنا آسان نہ تھا۔

(۳)

دوسرے روز وہ پھر درگاہ پہنچا۔ کل کی طرح ہجوم نہ تھا۔ پھول والوں نے اسے دیکھ کر ویسا ہی شور مچایا۔ اس نے پھول خریدے۔ پھول چڑھائے فاتحہ پڑھی آج کم لوگ تھے۔ نہ فقیر دائرہ بنائے بیٹھے تھے، نہ قوالی ہو رہی تھی۔ اس نے حضرت قبلہ کے بارے میں پوچھا اس کو ان کے گھر پہنچا دیا گیا۔ دالان میں مخصوص لوگ تھے جہاں وہ بیان فرما رہے تھے۔ وہ دروازے میں جوتوں کے قریب بیٹھ گیا۔

"علم دو ہیں......ایک علم ظاہر ہے جو مخلوق پر اللہ کی محبت ہے اور دوسرا علم باطن ہے جو علم نافع ہے۔ صوفیا اس بات کا خیال رکھتے تھے کہ علم کا اظہار عام لوگوں پر نہ کیا جائے۔ کم فہم لوگ غلط فہمیاں پھیلاتے ہیں۔ سالک جب تک کسی شیخ طریقت کا دامن نہ پکڑے اور حواسِ باطنی کو ترقی

دے کر عالم روحانی کی طرف اپنے کو رجوع نہ کرے اور ماسوااللہ قطعِ تعلق کر کے ارادت اختیار نہ کرے یہ علم اسے حاصل ہونے کا نہیں.......

وہ سر جھکائے سنتا رہا۔اذاں کے ساتھ بیان ختم ہوا۔وہ حضرت قبلہ سے ملنے کی ہمت ہی نہ کر سکا۔بعض لوگوں نے عجیب نظروں سے دیکھا لیکن کچھ پوچھا نہیں۔نماز کے بعد وہ بے مقصد گھومتا رہا۔

(۴)

''امی میری سمجھ میں کچھ نہیں آتا.......''اس نے ماں سے مرشد کی باتیں سنائیں۔''یہ سب تصوف کی باتیں ہیں۔ہمارے ابا کہتے تھے تصوف میں یہودیوں کے''زہاد''عیسائیوں کی رہبانیت'ایرانیوں اور مجوسیوں کے افکار، زرتشت کی تعلیمات ویدانت کا فلسفہ سب ایک دھارے میں شامل ہو گئے ہیں۔''وہ امی کو حیرت سے دیکھنے لگا۔امی نے باضابطہ تعلیم حاصل نہیں کی تھی لیکن نانا کی چہیتی بیٹی تھیں اس طرح کی بہت سی باتیں یاد تھیں۔انھوں نے اپنی بات کا سلسلہ جاری رکھتے ہوئے کہا:

''ایک روز حضرت نظام الدینؒ اولیاء اپنی خانقاہ کی چھت پر کھڑے تھے نیچے دیکھا کہ کچھ ہندو اپنے خاص قاعدے سے بتوں کی پوجا کر رہے ہیں انھوں نے اس پر بغیر کسی ناگواری کا اظہار فرمائے یہ مصرع پڑھا۔

ہر قومے راست راہے دینے وقبلہ گاہے

امیر خسرو نے سنتے ہی کہا

من قبلہ راست کروم برطرفِ کج کلاہے

''امی کیا میں بیعت کرلوں؟''

''تمھیں یہ خیال کیوں آیا؟''

''وہ تو کہتے ہیں سالک جب تک کسی شیخ طریقت کا دامن نہ پکڑے علم حاصل ہونے والا نہیں''

''تم علم حاصل کرنا چاہتے ہو؟''

''وہ باتیں اچھی تو لگتی ہیں''

''سوچ سمجھ کر فیصلہ کرنا.....'' کافی رات تک وہ جاگتا رہا۔اس نے عجیب سا خواب دیکھا۔طوفانی بارش ہو رہی ہے۔چاروں طرف اندھیرا ہے۔طوفانی ہواؤں اور تیز بارش میں ایک خیمہ روشن ہے۔دونوں بزرگ چراغ کی روشنی میں تلاوت کر رہے ہیں۔اس کے جسم پر بادشاہ کا لباس ہے وہ بزرگوں سے کہہ رہا ہے'' آپ جیسی برگزیدہ ہستیاں موجود ہوں اور مقصد میں ناکامی ہو تعجب ہے؟'' وہ بزرگوں سے اصرار کر رہا ہے۔وہ انکار کر رہے ہیں ان بزرگوں نے کہا کہ وہ ایک ٹھیکری لے آئے وہ کچھ لکھ کر دیں گے......وہ سارے میدان میں ٹھیکری ڈھونڈ رہا ہے۔کہیں ٹھیکری نہیں ملتی۔اچانک زور سے بجلی چمکی۔وہ گھبرا کے اٹھ بیٹھا۔اس کا دل زور زور سے دھڑکنے لگا۔حواس بحال ہوئے۔اب ایسے خواب ہی نہیں آتے جن سے بشارتیں ہوں...... آفس سے وہ سیدھا درگاہ چلا گیا۔آخری کنارے پر اس نے اپنی جگہ بنالی تھی جہاں اس پر حضرت قبلہ کی نظر پڑ سکتی تھی۔وہ چپ چاپ بیٹھ گیا۔حضرت قبلہ نے اس کی موجودگی کو شاید محسوس ہی نہیں کیا۔ ''بیعت؟'' وہ کہہ رہے تھے۔کیا تمھیں کر بلا یاد نہیں؟'' وہ کتنا خوف زدہ ہو کر دعا کرتے تھے کہ وہ ہمارے فرزندوں کو قتل کرتے ہیں اور ان کی عورتوں کو چھوڑ دیتے ہیں۔ہم نہیں جانتے کہ اس انجام گاہ میں ہماری صبح ہماری شام کے مقابلے میں کیا حقیقت رکھے گی ہم خدا کی نعمتوں پر شکر بجالاتے ہیں اور اس کی ڈالی ہوئی مصیبتوں پر صبر کرتے ہیں۔''

''کبھی کسی مصلحت کے لیے بیعت مت کرو۔جب تمھارا دل نہ چاہے.....دل کیا ہے......انھوں نے کہا تھا میرا دل ہر صورت اجاگر ہے، ہرنیوں کی چراگاہ ہے۔راہبوں کی پناہ

گاہ.......بتوں کا دیول، زائرین کے لیے کعبہ ہے۔توریت کی تعلیم ہے۔قرآن کی آیات ہے۔''

وہ کشمکش میں پڑ گیا۔کہیں اس کی طرف اشارہ تو نہیں، کہیں وہ بیعت کے لیے منع تو نہیں کرر ہے ہیں؟ آج بھی وہ اپنی بات کرنے کی ہمت نہ کر سکا۔ کتنے جمعرات آئے، جمعہ آئے اور چلے گئے۔ نہ بیعت ہوئی۔ نہ کبھی وہاں وہ کرایہ دار نظر آیا۔لیکن وہ روزانہ وہاں جانے کا عادی ہو گیا۔اسکوٹر والا چپ چاپ اسکوٹر رکھ لیتا۔وہ مخصوص فقیر جوتوں کی حفاظت کرتا۔ پھول والا پہلے سے اس کا پیکٹ تیار کر دیتا۔ وہاں سب اسے اچھی طرح جاننے لگے تھےاس نے خود کو حالات پر چھوڑ دیا۔وہ اب حضرت قبلہ سے اپنا مدعا بیان نہیں کرے گا۔اس فیصلے کے بعد اسے اس تذبذب سے چھٹکارا مل گیا تھا جس میں وہ ان کے سامنے بیٹھتے ہی مبتلا ہو جاتا تھا۔ان دنوں ایک سکون سا محسوس ہونے لگا تھا۔حضرت قبلہ ہمیشہ یہی کہا کرتے تھے۔غیب کا علم صرف عالم الغیب کو ہے۔کسی اور کو نہیں.......

(۵)

امی کو بزرگانِ دین کی دعاؤں پر پورا یقین تھا۔

''بیٹے دعا کے لیے کہو.....اللہ نیک بندوں کی دعائیں سنتا ہے......''امی نے گولکنڈہ کی فتح کا پورا قصہ پھر سے سنایا۔''بادشاہ دونوں بزرگوں کے آگے سر جھکائے کھڑا ہے انھوں نے اس سے ایک ٹھیکری منگوائی اس پر کوئلے سے کچھ لکھا اور کہاں وہاں لنگر خانے کے پاس ایک چمار بیٹھا ہے اس کو دے کر جواب لے آؤ۔اس خطرناک طوفانی رات میں بادشاہ ٹھیکری لے کر چمار کے پاس پہنچا۔ چمار نے ٹھیکری واپس کر دی۔اس نے وہ ٹھیکری بزرگوں کی خدمت میں پیش کی۔ بزرگوں نے مایوسی سے کہا،اب کچھ نہیں ہوسکتا۔۔ بادشاہ گڑگڑانے لگا۔دونوں نے اس کے شدید اصرار پر اسی ٹھیکری پر رُک رُک کر کچھ لکھا اور کہا اسی چمار کو دے آؤ۔ بادشاہ پھر چمار کے پاس پہنچا۔ٹھیکری دی۔ چمار کی آنکھیں غیض وغضب سے سرخ ہو گئیں وہ بار بار اس تحریر کو پڑھتا رہا اور بڑ بڑاتا رہا۔

چمار جذبات سے مغلوب ہوکر کانپنے لگا۔اس کے ہاتھ سے ٹھیکری چھوٹ گئی۔اس نے دامن جھاڑا اوراٹھ کھڑا ہوا۔وہ کہہ رہا تھا ''جب مشیت ایزدی یہی ہے تو میں کیا کرسکتا ہوں۔ پچاس برس اس قلعے کے دامن میں گوشہ نشین رہا آخر جیتے جی یہاں سے اٹھنا پڑا'' پھر وہ بادشاہ کی طرف دیکھتے ہوئے بولا ''جاؤان سے کہہ دو کہ وہ چلا گیا'' وہ چمار نہیں اس زمانے کے قطب تھے جوابوالحسن تانا شاہ کی سلطنت کی حفاظت کررہے تھےان کے جانے کے بعد قلعہ فتح ہوگیا........ ''ابا ان باتوں کو نہیں مانتے تھے۔اسے یادآیادہ کہتے تھے۔دراصل قطب شاہی جنرل عبداللہ خاں پنی نے غداری کی تھی اورقلعہ کادروازہ کھلا چھوڑ دیا تھا۔ایسے موقع پرامی مسکرا کرکہتیں ''روحانی معاملات مورخین کی دسترس میں نہیں ہوتے۔اجتماعی لاشعور کا حصہ بن جاتے ہیں۔'' بات سچ بھی تھی۔صدیاں گزر جانے کے بعد بھی یہ قصہ زندہ تھا۔آج بھی یہ درگاہ اقتدار کے خواہش مندوں کی آماجگاہ بنی ہوئی تھی۔بڑے بڑے منسٹر یہاں حاضری دیتے تھے۔

(۶)

ایک روز وہ رات دیر گئے گھر لوٹا تو اس کی بیوی جاگ رہی تھی۔کمپیوٹر کے سامنے بیٹھی شاید لڑکے سے انٹرنیٹ پر بات کررہی تھی۔کمپیوٹر کے اسکرین سے نکلتی رنگین شعاعوں کا عکس اس کے چہرے، گردن اور گریباں سے جھانکتے سینے پر پڑ رہا تھا۔اس کی بیوی اسے خوب صورت لگی۔ بعض عورتیں ایک عمر کو پہنچنے کے بعد خوب صورت لگتی ہیں۔اس کی بیوی بھی اب پہلے سے زیادہ خوب صورت نظر آتی تھی۔کئی افرادِ خاندان نے اس کا اظہار بھی کیا تھا......اسے خود بھی اس کا شدید احساس تھا۔کتنے دن ہوگئے اس نے اپنی بیوی کی طرف نظر بھر کے نہیں دیکھا تھا۔

''کیا ہوا۔بہت دیر کردی'' بیوی نے پوچھا۔

''ہاں یوں ہی بیٹھ گیا تھا۔''

''کب تک یہ سلسلہ چلتا رہے گا؟''

’’پتہ نہیں۔ تقدیر میں ہوگا تو وہ مکان واپس مل جائے گا‘‘

’’پھر روزانہ کیوں چکر کاٹ رہے ہو۔ گھر میں ہی بیٹھے بیٹھے تقدیر بدلنے کا انتظار کیوں نہیں کرتے؟‘‘ بیوی نے تلخی سے کہا

اس کے جی میں آیا کہ کوئی سخت جواب دے۔ لیکن امی کی بات یاد آ گئی ’’بیٹا حضرت علیؓ کے پاس ایک شخص حاضر ہوا۔ اس کے ہاتھ میں روٹی تھی اس نے پوچھا اس روٹی کا کھانا اس کی تقدیر میں ہے یا نہیں؟ حضرت علیؓ نے جواب دیا ’’اگر وہ کھائے گا تو اس کی تقدیر میں ہے ورنہ نہیں‘‘ وہ چپ ہوگیا۔ بیوی نے طنزیہ انداز میں مسکرا کر اس کی طرف دیکھا........

تھوڑی دیر پہلے اس کا دل چاہتا تھا کہ بیوی کی گود میں سر رکھ کر اپنا جی ہلکا کرے۔ سارے جذبات ہوا ہو گئے وہ عجیب سی کشمکش میں تھا۔ مکان کا حصول، دنیا کے لیے بھاگ دوڑ سب کچھ حقیر سا لگ رہا تھا۔ دنیا کی بے ثباتی کا احساس بڑھتا جا رہا تھا۔ اسے صرف حضرت قبلہ کے یہاں سکون ملتا تھا۔ کہیں کسی کام میں دل نہیں لگتا تھا۔ شام ہوتے ہی ایک انجانی طاقت اسے وہاں کھینچ لاتی۔ ان کی باتیں ذہن میں گونجا کرتیں۔ جس طرح عالمِ محسوسات یعنی عالم جسم کے لیے دل کی طرف جو حواسِ خمسہ کے پانچ دروازے ہیں اسی طرح عالم ملکوت یا عالم روحانی کی طرف بھی دل کا ایک دروازہ ہے۔ حضرت قبلہ کی شخصیت اس دروازے پر دستک دے رہی تھی۔ ترک کرو۔ ترک دنیا..... ترکِ ذات، ترکِ عقبیٰ اور آخر میں ترک مولا۔ ترکِ ترک، ترک علائق ترک آرزو اور سب سے آخر میں شئے کا ترک.......!! حضرت قبلہ کی باتیں کچھ کچھ اس کی سمجھ میں آنے لگی تھیں۔ اس نے بیوی کی طرف عجیب نظروں سے دیکھا اور کروٹ بدل کر سو گیا۔

(۷)

اس نے فیصلہ کرلیا کہ اپنی بیوی کو بیٹے کے پاس بھیج دے گا اور کسی چھوٹے سے مکان میں اپنی ماں کے ساتھ رہ لے گا۔ گھر ملے یا نہ ملے وہ حضرت قبلہ سے بیعت کر کے ساری زندگی ان

کی خدمت میں گزار دے گا۔ وہ اپنے آپ سے بے خبر رہنے لگا۔ چہرے پر اچھی خاصی داڑھی نکل آئی تھی۔ بال بھی بڑھ گئے تھے۔ سہولت کی خاطر وہ ڈھیلا ڈھالا لباس پہننے لگا تھا۔ درگاہ میں سب اسے جاننے لگے تھے۔ کبھی وہ فقیروں کے حلقے میں بیٹھ کر چلم کے کش لگا لیتا۔ کبھی قوالی ختم ہونے تک بیٹھا رہتا۔ نہ اس نے کبھی حضرت قبلہ سے اپنا مدعا بیان کیا نہ انھوں نے کبھی اس کی جانب توجہ کی۔ طرح طرح کے لوگ ان سے ملنے آتے اپنی حاجتیں بیان کرتے ان سے دعا کرنے کے لیے کہتے۔ لیکن وہ حالات پر قانع و صابر ہو گیا۔ ان تبدیلیوں کے باوجود اس کی طبیعت میں نفاست تھی۔ داڑھی اور سر کے بال تراشا کرتا۔ لباس صاف ستھرا اور خوشبو میں بسا ہوا۔ خاندان بھر میں اور دوستوں میں یہ بات مشہور ہو گئی تھی کہ وہ فقیروں جیسا ہوتا جا رہا ہے۔ اسے کسی کی باتوں کی پرواہ نہیں تھی۔

ایک دن روز کی طرح وہ حضرت قبلہ کی خدمت میں پہنچا تو وہ کہہ رہے تھے ''فقیر وہ ہے جس کے پاس کوئی چیز نہ رہے اور اگر اس وقت ہے تو پھر نہ رہے وہ حاجت مند بھی نہ ہو۔ جو کچھ اسے نصیب ہو اسی پر قناعت کرے۔ خدا سے طلب کرنے کی ممانعت ہے یہاں تک بہ وقت مرگ وہ جنت کی دعا نہ کرے اس کی سب سے افضل دعا ہے اے اللہ مجھے مسکین زندہ رکھ مسکین کی موت دے اور مسکینوں کے ساتھ قیامت میں اٹھا...... ''ادھر دیکھو انھوں نے خلا میں گھورتے ہوئے کہا'' ان کے ایک ہاتھ میں پانی کا لوٹا ہے دوسرے ہاتھ میں جلتی مشعل........ وہ دوزخ کو ٹھنڈا اور جنت کو جلا ڈالنا چاہتی ہیں اس لیے کہ گناہ یا نیکی کا تصور، خوف و لالچ کے زیر اثر نہ رہے''....... محفل برخواست ہو گئی۔ وہ سب کھڑے ہو گئے۔ حضرت قبلہ نے اسے اشارے سے روکا۔ وہ ٹھہر گیا۔ دل زور زور سے دھڑک رہا تھا۔

پتہ نہیں کیا خطا ہو گئی۔ وہ سب کے سب ایک ایک کر کے باہر نکل گئے۔ حضرت قبلہ رہ گئے۔ انھوں نے اسے قریب بلایا۔ اسے سینے سے لگا کر بھینچا۔ پشت تھپتھپائی۔ اس کی آنکھوں سے

آنسوراواں ہوگئے۔ جیسے خشک ترخی ہوئی زمین پر پانی کی بوندیں گری ہوں۔ سوندھی سی خوشبو پھیل گی۔ جیسے قلعہ کی پرانی فصیل کو چیر کر بڑ کا درخت نکل آیا ہو۔ وہ کپکپانے لگا۔ وہاں سے نکل کر وہ سیدھے گھر کی طرف گیا۔ پاؤں زمین پر نہیں پڑ رہے تھے۔ جیسے وہ تیر رہا ہو۔ کوئی قوت اسے گھر کی جانب دھکیل رہی تھی۔ وہ اسی کیفیت میں گھر پہنچا........اس کی بیوی نے پُر جوش انداز سے اس کا استقبال کیا۔

''آج تو کمال ہوگیا۔ یہ دیکھئے، یہ دیکھئے'' اس کی بیوی خوشی کے مارے چیخ پڑی ہماری گھر کی چابی....... کرایے دار نے ہمارا گھر خالی کر دیا اور یہ چابی دے گیا....... کمال ہو گیا۔ ہے نا.....؟''

اس نے خالی نظروں سے بیوی اور ماں کی طرف دیکھا.......وہ لوگ کچھ کہہ رہے تھے۔ اسے کچھ سنائی نہیں دے رہا تھا۔ نہ خوشی کی کیفیت تھی نہ حیرت کی........وہاں تو کچھ بھی نہ تھا۔ ایک خلا....... سینے میں دل کی جگہ کوئی ہلکی پھلکی شے تھی۔ دھواں، روئی کا گالا، کوئی ملائم شئے جو تیزی سے پگھل رہی تھی۔ اس کی آنکھیں ڈبڈبا گئیں۔ کچھ نظر نہیں آرہا تھا۔ کان سائیں سائیں کر رہے تھے۔ جیسے ایک شور تھا ہو۔ وہ اوپر ہی اوپر اٹھتا جا رہا تھا۔

''اے اللہ مجھے مسکین زندہ رکھ.......''

اس کے منہ سے بے اختیار نکلا.......اور آنسو بہنے لگے۔

☆☆☆

رنگ کا سایہ

ہم اسی جگہ جا رہے تھے جہاں سے ہمیں راتوں رات افراتفری کے عالم میں بھاگنا پڑا تھا۔امّی کا تو صرف جسم ساتھ آیا تھا روح شاید وہیں بھٹک رہی تھی۔ پھر جسم بھی اس قابل نہیں رہا کہ ان کے وجود کا بار اٹھا سکتا۔ آج اس جسم کو اسی زمین کے سپرد کرنا تھا۔

ویان میں امّی کا بے جان جسم رکھا تھا۔ میں اور بہن پچھلے حصے میں بیٹھے تھے۔ بہنوائی ڈرائیور کے ساتھ والی سیٹ پر تھے۔ بہن نے غم سے نڈھال ہو کر آنکھیں موند لیں۔ میری آنکھوں میں نیند کا کوسوں پتہ نہ تھا۔ کیا امّی کی موت کا ذمہ دار میں ہوں؟ ان کا اکلوتا بیٹا' جسے وہ جان سے زیادہ پیار کرتی تھیں۔ دیوانہ وار چاہتی تھیں۔نہیں!! امّی کو گھر چھوڑنے کا غم تھا۔لیکن گھر تو چھوٹا میری ہی وجہ سے میرے اور لکشمی کے عشق کی وجہ سے _____! گھر چھوڑ کر تو سب بھاگے تھے۔ پھر اس کے ذمہ داری ہمارے عشق پر کیسے آگئی؟ میں نے خود کو سمجھانے کی کوشش کی لیکن دل میں کوئی

چور تھا۔

''امّی ہمارا اپنا گھر کیوں نہیں ہے''میں نے امّی سے پوچھا تھا جب ہم خالہ کا گھر چھوڑ رہے تھے۔

''زندگی نے اتنی مہلت ہی نہیں دی بیٹھے''امّی نے ٹھنڈی سانس بھر کے کہا۔''پولیس ایکشن نے ساری بساط اُلٹ دی۔ دکن میں مسلمانوں کے چھ صدیوں کے اقتدار کا خاتمہ ہو گیا لاکھوں مسلمان مارے گئے' سینکڑوں خواتین نے خودکشی کر لی۔ کسی کی کچھ سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ کیا ہوگا۔ اونچے درجے کے سرکاری ملازم علاحدہ کردیئے گئے یا ان کے عہدوں کو تنزلی دے دی گئی' جاگیرداری نظام ختم ہو گیا۔ ان اقدامات سے تنگ آکر کئی ملازمین نے قبل از وقت وظیفہ لے لیا۔ تمھارے ابّا نے بھی وظیفہ لے لیا۔ کچھ برس تک اسی تذبذب میں رہے کہ یہاں رہیں کہ پاکستان چلے جائیں۔ اسی کشمکش میں گھر نہیں بنوایا۔ ہمیشہ اونچا سوچتے تھے۔ اچھی زندگی گزارنے کے عادی تھے۔ جو بھی پیسہ تھا وہ طرز زندگی نبھانے اور تمھاری بہن کی شادی پر خرچ کیا۔ وظیفہ بھی اتنا تھا کہ سفید پوشی برقرار رہ سکتی لیکن اچانک موت نے انھیں ہم سے چھین لیا۔''

مجھے یاد ہے امّی کے عدت کے دن پورے ہونے کے بعد خالہ ہمیں اپنے ساتھ گھر لے گئی تھیں ہم خالہ کے ساتھ رہنے لگے۔ امّی کے خاندان پر ابّا کے بہت سے احسانات تھے۔ امّی بتاتی تھیں۔

ضلع میں ایک ہی اسکول تھا۔ اردو' تلگو اور مراٹھی میڈیم کی کلاسس قائم تھیں۔ اسکول کے بعد کتب خانوں میں ناول پڑھنا۔ پہلے دن فلم دیکھنا اور بنا کا گیت مالا پابندی سے سننا۔ یہی نوجوانوں کے شوق تھے۔ ریڈیو سننے کے لیے نوجوان ہوٹلوں میں جمع ہوتے تھے۔ بڑے جی ای سی کے ریڈیو کے طاقت ور اسپیکر پر محمد رفیع کا کوئی گیت بجتا تو ٹیبل پر رکھے گلاس تھرتھرانے لگتے۔

محدود زندگی۔ مخصوص چہرے.....!

خالہ کے ساتھ رہتے ہوئے چار پانچ برس ہوگئے تھے۔ خالہ زاد بہنیں اور بھائی بڑے ہو گئے تھے۔ خالہ کے لیے گھر نا کافی ہورہا تھا۔ خالہ اور خالو میں اکثر بحث ہونے لگتی۔ امّی بھی اسے محسوس کررہی تھیں۔ مجھے بھی احساس تھا کہ خالہ مروت میں کچھ کہہ نہیں پارہی ہیں۔ مجھے اپنے پیر پر کھڑے ہونے میں کافی وقت تھا۔

ایسے میں یہ اطلاع ماموں لے کر آئے کہ آبادی سے دور بیڑی مزدوروں کے لیے ایک سرکاری کالونی بنائی گئی ہے۔ بیڑی کے کارخانے کا سرٹیفکیٹ اور ضروری کاروائی کے لیے لیبر آفیسر کو تھوڑی سی رشوت دینے کی ضرورت ہے۔ امّی ایک بیڑی کے کارخانے میں سنجیدگی سے بیڑیاں بنانا سیکھنے لگیں۔ ان کا خیال تھا کچھ آمدنی بھی ہوجائے گی۔ ایک دو ماہ میں سرٹیفکیٹ بھی مل گیا۔ ماموں کی کوششوں سے ہمیں ایک سنگل روم مکان الاٹ ہوگیا۔ ماموں ان کے کچھ احباب' مسلمانوں کے چار' چھ خاندان بھی اس کالونی میں آگئے۔

زندگی میں پہلی بار میں نے کوئی کالونی دیکھی تھی۔ ایک کمرے اور دو کمرے والے مکانات ایک ہی وضع کے۔ ایک قطار میں تعمیر کیے گئے تھے۔ یہ علاقہ شہر سے پانچ میل دور تھا۔ ریلوے کراسنگ پر شہر ختم ہوجاتا تھا۔ ریلوے گیٹ کے پار ایک سنیما ہال تھا۔ دیہات جیسا ماحول تھا۔ دور دور ایک آدھ مکان نظر آجاتا۔ ایک شمشان گھاٹ تھا۔ بیڑی کے کارخانے تھے۔ کارخانوں میں بڑے بڑے ہال بنے ہوئے تھے جس میں عورتیں اپنی ٹانگیں لمبی کیے ان پر دھات کا سوپ رکھے بیڑیاں بناتی تھیں۔ مشین کی طرح ہاتھ چلتے تھے۔ آپس میں باتیں بھی کرتی جاتیں اور بیڑیاں بھی بنایا کرتیں۔ ایک سائیکل ٹیکسی تھی۔ پھر چنوں کا ایک تنور لگا تھا۔ جب بڑی سی کڑھائی میں چنے ڈالے جاتے تو فضا میں سوندھی سی خوشبو پھیل جاتی۔ شہر سے یہاں تک کنکریٹ کی روڈ تھی جس پر لال مٹی بچھادی گئی تھی۔ بارش میں یہ مٹی بہہ جاتی اور پتھر اُبھر آتے بعض جگہوں پر گڑھے بن

جاتے۔ادھر رکشہ نہیں چلتے تھے۔اسکول کافی فاصلے پر تھا امّی نے ایک پرانی سائیکل دلا دی۔

امّی بہت خوش تھیں۔ان کے اپنے گھر کا خواب پورا ہونے جا رہا تھا۔ایک مدت بعد مکانات رہنے والوں کے نام کر دیے جاتے۔ایک عجیب سی آزادی کا احساس ہوا۔بجلی کا کنکشن تھا۔نلوں کے پائپ فٹ تھے ٹوٹیاں لگی تھیں لیکن پانی کی پائپ لائن یہاں تک نہیں آئی تھی۔مستقبل قریب میں اس کا امکان بھی نہ تھا۔کالونی سے کچھ فاصلے پر کھیت تھے ان کھیتوں کو ایک نالے کے ذریعہ پانی پہنچایا جاتا تھا۔اسی نالے کے پانی سے ضرورتیں پوری ہو جاتی تھیں لیکن پینے اور پکوان کے لیے کنوئیں سے پانی لانا ضروری تھا۔کالونی میں ایک ہی کنواں تھا۔کنویں میں دونوں طرف چرخیاں لگی تھیں۔یہ چرخیاں خود یہی تقسیم ہو گئیں مسلمانوں کی اور ہندوؤں کی۔ہندو عورتیں پانی بھرتی تھیں اور مسلمان مرد۔زندگی میں پہلی بار ہندوؤں کے ساتھ رہنے کا اتفاق ہو رہا تھا۔میں تلگو نہیں جانتا تھا۔ایک ڈول اور رسی خرید لی گئی۔پہلی بار ڈول پانی میں چھوڑا تو پانی میں ڈوبنے کے بعد بہت ہلکا پھلکا ہو گیا لیکن پانی سے باہر آتے ہی کافی وزنی ہو گیا۔ایک جھٹکا لگا۔کسی نہ کسی طرح ڈول اوپر کھینچ لیا لیکن رسی پکڑے رکھ کر آگے جھک کر پانی سے بھرا ہوا ڈول سنبھالنا اور اسے گھڑے میں انڈیلنا آسان کام نہ تھا۔گھڑا بھرنے کے بعد اسے اٹھا کر گھٹنے پر رکھنا پھر اٹھا کر کندھے پر جمانا اور تین فرلانگ لمبا راستہ طے کرنا بڑی مشقت کا کام تھا۔پسینے چھوٹ جاتے۔ہندو عورتوں کو دیکھ کر بڑی شرمندگی ہوتی تھی وہ پیتل کے چمک دار گھڑے لے آتیں جلدی جلدی پانی کھینچتیں بڑی مہارت سے گھڑا اُٹھا کندھے پر رکھ کر تیز تیز قدموں سے چلی جاتیں۔پانی بالکل نہ چھلکتا۔میرے سارے کپڑے بھیگ جاتے تھے۔جتنی دیر میں ایک گھڑا پہنچا کر واپس آتا۔وہ دو گھڑے لے جاتیں۔میرے اناڑی پن پر وہ منہ چھپا کر ہنستی تھیں۔دوسرا مسئلہ یہ تھا کہ اگر کوئی مسلمان کسی ہندو کا گھڑا چھو لیتا تو وہ ناپاک ہو جاتا۔سارا پانی پھینک دیا جاتا۔گھڑا اچھی طرح مانجھ کر دھویا جاتا۔تب دوبارہ پانی بھرا جاتا۔اس دوران وہ غصے سے بڑبڑاتی رہتیں یا اونچی آواز میں ڈانٹنے لگتیں۔

اس صورت حال سے بچنے کے لیے میں صبح صبح پانی بھرنے کے لیے پہنچا۔ کنویں پر صرف ایک دھندلا سا ہیولہ نظر آیا۔ قریب سے دیکھا۔ لکشمی تھی جو ہمارے مقابل والے مکان کے بغل میں رہتی تھی۔ مجھے اناڑی پن سے پانی کھینچتے دیکھ کر وہ زور سے ہنس پڑی۔ اس نے تلگو میں کچھ کہا۔ میں سمجھ نہ سکا۔ وہ میری طرف آ گئی۔ مجھے ایک طرف ہٹا کر خود پانی کھینچنے لگی۔ منٹوں میں میرا گھڑا ابھر دیا۔ گھڑا اٹھانے میں میری مدد کرنے کے لیے آگے آئی اتنا قریب آ گئی کہ میرا دل زور سے دھڑ کنے لگا۔ جسم کانپنے لگا اور گھڑا ہاتھ سے چھوٹ گیا۔ لکشمی سر سے پاون تک بھیگ گئی۔

''پچی پلّا گاڈو''۔[1] لکشمی ہنسنے لگی۔

میرے چہرے پر شرمندگی کے تاثرات تھے۔ میں نے سر اٹھا کر لکشمی کی طرف دیکھا تو بس دیکھتا ہی رہ گیا۔ لباس بھیگ کر اس کے جسم سے چمٹ گیا تھا' پو بھٹ رہی تھی۔ اس کا چہرہ روشن ہونے لگا۔ پھر وہ سورج کی کرنوں میں نہا گئی۔ جسم کے سارے خطوط واضح ہو گئے۔ وہ بدن اتنا سڈول تھا اس میں ایسی دلکشی اور رعنائی تھی کہ سارے جسم میں ایک سنسنی سی دوڑنے لگی۔ اپنے مرد ہونے کا شدید احساس ابھر آیا۔ لکشمی نے اپنا گھڑا اٹھایا اور چلی گئی۔

لکشمی صبح چار بجے جاگتی تھی۔ آنگن میں جھاڑو لگاتی۔ اس پر گوبر کا چھڑکاؤ کرتی۔ نہا دھو کر بڑے انہماک سے مگو (رنگولی) سجاتی۔ بالماں ذرا دیر سے جاگتی۔ نہا دھو کر گیلے بالوں سے ناشتہ بناتی۔ اس دوران ملیا جاگتے ہی اپنے رکشہ میں بکٹ اور ڈول رکھ کر کنوئیں پر جاتا اپنا رکشہ دھو کر' نہا کر واپس آتا۔ بالماں ناشتہ کر کے بیڑی کے کارخانے کو چلی جاتی۔ ملیا رکشہ لے کر نکل جاتا۔ لکشمی اسکول جاتی۔ ناگماں گھر پر رہ جاتی۔ اکثر پرانے کپڑوں کے مضبوط ٹکڑوں کو جوڑ کر بنتہ[2] سیتی رہتی۔ کبھی چاول اور جوار صاف کرتی میں بھی آبادی میں چلا جاتا تو امی اکیلی رہ جاتیں۔ سوپ لے کر بیٹھ جاتیں اور بیڑیاں بناتیں۔ امی ٹھیک سے بیڑیاں نہیں بنا پاتی تھیں۔ ان کی بنائی ہوئی

---

[1] دیوانہ لڑکا [2] پرانے کپڑوں کے ٹکڑوں سے جوڑ کر بنائی گئی چادر

اکثر بیڑیاں رد کردی جاتیں۔ بہت کم پیسہ ملتا تھا۔ بالماں بیڑیاں بنا کر اچھا خاصا کما لیتی تھی۔ وہ گھر پر بھی بیڑیاں بناتی تھی۔ وہ بہت ماہر تھی۔ لوہے کی قینچی سے ایک سائز کے پتے کچھ اس طرح کاٹتی تھی کہ دھبے لگے ہوئے حصے الگ ہو جاتے۔ سارے پتے ایک سائز کے بنانے کے بعد ان میں تمباکو رکھ کر لپیٹتی۔ نچلے حصے پر سرخ دھاگے لپیٹ دیتی۔ اوپری حصہ پوری طرح بند کرنے کے بعد نچلے حصے میں خلا رکھ دیتی۔ ساری بیڑیاں ایک جیسی، مشین میں ڈھل کر نکلی ہوں۔ اس کے پاس کافی زیور تھا۔ وہاں کی ساری عورتوں کو زیور کا شوق تھا۔ ہر عورت کے گلے میں گنتا فسل[۳]، بازوؤں میں کڑے، کلائیوں میں سونے کی چوڑیاں، کمر پٹا، پیروں میں چین، پاؤں میں بچھوے، کانوں میں تنکے، ناک میں لونگ....! کھانے اور کپڑوں پر زیادہ توجہ نہیں دیتے تھے۔ ان کے بلاوز کے آستین بہت چست ہوتے۔ کمر کھلی۔ بلاوز کے اندر کچھ بھی نہیں پہنتیں تھیں ان کے کسے ہوئے جسموں کو کسی سہارے کی ضرورت بھی نہ ہوتی۔ ساڑھی کا کاشٹا[۴] باندھتی تھیں۔ لڑکیاں لہنگا اور جیکٹ پہنا کرتی تھیں جس میں ان کے بدن کے خطوط واضح نہیں ہوتے تھے۔

سب کچھ لٹ جانے کے بعد بھی مسلمانوں میں ایک طنطنہ تھا۔ وہ اپنی سفید پوشی برقرار رکھنے کی پوری کوشش کرتے تھے۔ اونچے اور متوسط طبقے میں جو بھی ہوا ہو۔ عام ہندو اب بھی مسلمان شرفا کی عزت کرتے تھے۔ ملیا کا پورا خاندان امی کو درسانی (بیگم صاحبہ) کہتا تھا۔ ان سے ادب سے گفتگو کرتے تھے۔ امی کو کبھی شہر جانا ہوتا۔ کسی رشتے دار سے ملنا ہوتا۔ یا کلکٹر آفس سے وظیفہ لینے کے لیے جانا ہوتا تو وہ ملیا کے رکشہ میں جاتی تھیں وہ کبھی امی سے کرایے کی بات نہیں کرتا تھا اور امی بھی اسے توقع سے زیادہ ہی دیتی تھیں حالاں کہ گھر بڑی تنگی سے چل رہا تھا۔ مثل مشہور تھی ''حیدرآباد نگینہ اندر مٹی اوپر چونا'' سب کچھ تیزی سے بدل رہا تھا۔ حالی اور کلدار سکوں کی جگہ نئے پیسے آ گئے تھے۔ سیر کی جگہ کلوگرام! امی اور نا گماں دونوں اس بات پر متفق تھیں کہ اس تول میں

---

[۳] سونے کے موتیوں کا زیور [۴] مہاراشٹرائین طرز کی ساڑھی

برکت ہے اور نہ پیسوں میں۔ پھر بھی امی ہر عید کا اہتمام کرتی تھیں۔ رجب میں کونڈے، محرم میں روٹ، چنگے، شربت اور قبولی۔ شب برأت کی تیاریاں خاص طور پر کی جاتیں ابّا کی قبر پر جانا ضروری ہوتا۔ رات بھر امی عبادت میں مصروف ہوتیں۔ رمضان تو رمضان ہی تھا۔ سارے پڑوسیوں کو حصہ بھیجا جاتا۔ لکشمی کے گھر بھی حصہ ضرور جاتا۔ کالونی میں نہ کوئی مندر تھا اور نہ مسجد۔ جمعہ کے لیے مسلمان، آبادی کی جامع مسجد چلے جاتے۔ ہندو پوجا کے لیے کالونی سے باہر پہلے سے بنے ہوئے مندر جاتے۔

میں بہت صبح جاگ جاتا اور انتظار کرتا کہ لکشمی کب کنوئیں پر جاتی ہے۔ لکشمی کے ڈول اور گھڑا لے کر نکلتے ہی میں بھی نکل پڑتا۔ لکشمی نے محسوس کر لیا کہ میں اس کے لیے کنوئیں پر آتا ہوں۔ اس نے کبھی کوئی اعتراض نہیں کیا۔ نہ بے رخی کا اظہار کیا۔ خوش دلی کے ساتھ مجھ سے باتیں کرتی۔ ہم بہت جلد بے تکلف ہو گئے۔ لکشمی میرے حواس پر چھاتی جا رہی تھی ساری رات کروٹیں بدلتے گذرتی۔ شام اس کے اسکول سے لوٹنے کا بے چینی سے انتظار کرتا۔ میں جانتا تھا لکشمی بھی مجھے پسند کرتی ہے لیکن ہم دونوں ہی اظہار کرنے سے گھبراتے تھے۔

ایک دن میں نے مصمم ارادہ کر لیا کہ اپنے دل کی بات لکشمی سے کہہ دوں گا۔ دوسری صبح لکشمی اور میں پانی بھرتے رہے جب لکشمی نے اپنا آخری گھڑا کندھے پر رکھا۔ دوسرے ہاتھ میں رسی اور ڈول تھام کر لوٹنے لگی تو میں اس کے سامنے آ کر کھڑا ہو گیا۔

''کیا بات ہے؟ ہٹو سامنے سے۔''

''مجھے تم بہت اچھی لگتی ہو لکشمی!''

''ہٹو راستے سے۔ کوئی دیکھ لے گا''

''مجھ سے اکیلے میں ملنے کا وعدہ کرو''

لکشمی خاموش رہی۔

''میں شام میں کھیتوں کے پاس تمھارا انتظار کروں گا'' میں نے جلدی جلدی کہا اور راستے سے ہٹ گیا۔لکشمی گھر کی طرف چلی گئی۔

شام تک میں تذبذب اور بے چینی کی حالت میں رہا۔شام ہوتے ہی میں کھیتوں کے پاس پہنچ گیا۔کافی دیر انتظار کرنے کے بعد بھی لکشمی نہیں آئی تو میں مایوس ہو کر لوٹنے لگا۔راستے میں لکشمی مل گئی۔

''تم آئیں کیوں نہیں'' میں نے ناراضگی سے کہا''

''اماں کا کام ختم اچھ نئیں ہوا تھا''

''کب سے انتظار کر رہا ہوں''

''شما کر دو'' لکشمی نے عجیب انداز میں کہا''

میں نے اس کا ہاتھ پکڑ لیا۔اس نے ہاتھ نہیں چھڑایا۔نرم نرم سا ننھا ہاتھ۔

''میں اچھا لگتا ہوں تمھیں؟'' میں نے اس کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے کہا۔اس کے چہرے کا رنگ بدل گیا۔

''ہاتھ چھوڑ و''

''جواب دو''

''ہوں'' ______ میں نے مارے خوشی کے لکشمی کو لپٹا لیا۔لکشمی چپ چاپ سینے سے لگی رہی۔زندگی کا پہلا تجربہ تھا۔دل زور زور سے دھڑک رہا تھا۔میں نے اس کے دل کی دھڑکن محسوس کی جیسے کوئی پرندہ ہانپ رہا ہو۔کان گرم ہو گئے۔چہرہ تپنے لگا۔حلق خشک ہو گیا۔خوف اور مسرت کی عجیب کیفیت تھی۔کھیت میں سرسراہٹ ہوئی۔ایک بکری نکل کر بھا گی۔ہم الگ ہو گئے۔لکشمی نظر نہیں ملا پا رہی تھی۔اس نے کھیت سے ایک گنا توڑ لیا۔اس کے دو ٹکڑے کیے ایک مجھے دیا۔میں دانتوں سے گنا چھیل کر کھانا جانتا تھا۔ضلع کا ہر بچہ جانتا تھا۔یہاں سے پچاس میل

دور پر شوگر فیکٹری تھی۔ ہمارا اسکول ریلوے اسٹیشن کے قریب تھا۔ گنا بیل گاڑیوں میں لد کر اسٹیشن آتا وہاں سے ویگنوں میں بھر کے فیکٹری بھیجا جاتا۔ لڑکوں کا بیل گاڑیوں سے گنا چرالینا عام بات تھی۔ ہم لوگ گنا کھاتے ہوئے ندی کی طرف بڑھنے لگے۔ گنے کے رس سے حلق کی خشکی کچھ کم ہوئی۔ ہم لوگ ندی کے کنارے پانی میں پیر چھوڑ کر بیٹھ گئے۔ ایک فرحت بخش احساس ہوا۔

آپ کے پاؤں کتنے گورے ہیں'' لکشمی نے کہا

''صرف پاؤں؟'' میں نے ہنستے ہوئے کہا

''نہیں آپ بھی بہت سندر اور گورے ہیں۔ راجکماروں جیسے''

''راج کمار؟ میں زور سے ہنسا'' کیا یہاں بھیس بدل کر غریبوں کا حال معلوم کرنے کے لیے آیا ہے؟''

''سچ میں سوچتی ہوں آپ لوگاں یہاں کیوں آئے۔ بیڑی بنانے والوں کی کالونی میں''

''مکان کی خاطر!'' میں نے لکشمی کو اپنے بارے میں بتایا۔ لکشمی کی آنکھوں میں ہمدردی تھی۔ ''اب چلو، بہوت' دیر ہوگئی'' لکشمی نے کہا'' ہم روز ملیں گے نا'''' میں نے اس کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے کہا۔

''ہاؤ'' لکشمی نے دھیرے سے کہا اور آنکھیں جھکالیں۔

ہم لوگ واپس ہو گئے۔ میری خوشی کا کوئی ٹھکانہ نہ تھا لکشمی میری زندگی میں آنے والی پہلی لڑکی تھی۔ مجھے گمان بھی نہیں تھا کہ ایک ہی ملاقات میں لکشمی اتنی قریب آ جائے گی۔ میں ساری رات سو نہ سکا۔ سرشاری اور تشنگی کا ملا جلا احساس تھا۔ کسی لڑکی کے بدن کا پہلا لمس کتنا سنسنی خیز ہوتا ہے اس کا پہلی بار احساس ہوا۔ بار بار لکشمی کا خوب صورت چہرہ' نسوانیت سے بھرپور بدن نظروں کے سامنے آجاتا لکشمی کے چہرے پر عجیب سی کشش تھی۔ اس کی کالی کالی بڑی بڑی آنکھوں میں بے

پناہ جاذ بیت تھی۔ ناک تھوڑی سی چھوٹی تھی لیکن بھرے بھرے گالوں پر اچھی لگتی تھی۔ چھوٹا سا دہانہ۔ نازک سے ہونٹ۔ چمک دار دانت' جب ہنستی تو چہرے پر معصومیت کی لہر دوڑ جاتی۔ گالوں میں گڑھے بن جاتے۔ لمبے سیاہ بال۔ صاف جلد۔ رنگ بہت گورا نہیں تھا لیکن چہرے پر بے پناہ نمک تھا۔ محنت کش لڑکیوں کی طرح مضبوط بدن تھا۔ اس کی شخصیت میں بانکپن تھا۔

میں دن بھر لکشمی سے ملنے کے لیے بے چین رہنے لگا۔ ایک عجیب سی دیوانگی تھی۔ لکشمی کے علاوہ کچھ سوجھتا ہی نہیں تھا۔ ان دنوں میں بے کار تھا۔ میٹرک پاس کر چکا تھا۔ کالج کی پڑھائی کا سوال ہی نہیں تھا۔ ملازمت حاصل کرنا بہت مشکل تھا۔ سب کے مشورے سے ٹائپ سیکھنے کے لیے جانے لگا۔ ٹائپ اور شارٹ ہینڈ کی بہت قدر تھی۔ گھنٹہ بھر ٹائپ کی پریکٹس کرتا۔ ادھر اُدھر دوستوں میں وقت گزار کر لکشمی کے اسکول سے لوٹنے تک واپس آجاتا۔

ہم پابندی سے ملنے لگے۔ شام کھیتوں کے پاس ملتے۔ کسی کو ذرا سا شبہ بھی نہیں ہوا تھا۔ ایک دن لکشمی بہت خوش تھی۔

''دیکھو۔ بھابھی نے مجھے سونے کی انگوٹھی دی ہے'' اس نے انگوٹھی اُتار کے میرے ہاتھ میں دے دی۔

''اچھی ہے۔ تمھیں سونا پسند ہے؟''

''ہر عورت کو پسند ہوتا ہے۔ ہماری کالونی کے سارے عورتاں یہ اچ کرتے۔

مزدوری کر کے پیسے جمع کرنا اوز یور بنانا۔''

''ایک بات بتاؤں''

''ہوں''

''امّی کے پاس سونے کا ایک تار بھی نہیں ہے''

وہ حیرت زدہ رہ گئی۔ ایسا کیسے ہوسکتا؟''

''ایسا ہی ہے۔ ہم لوگ بھی نا۔ سارا پیسہ زبان کے چٹخارے' عیدوں اور رسموں پر خرچ کردیتے ہیں''

''میرے پاس ایک ترکیب ہے''

''کیا......؟''

''کسی مال دار لڑکی سے شادی کرلو۔ ڈوری میں خوب پیسہ اور ایک گھر لے لینا۔ زیور بھی آجائیں گا''

''مذاق اڑارہی ہو میرا؟''

''نئیں سچی۔ تم کو خوب صورت لڑکی بھی مل سکتی ہے اور یہ سب کچھ بی''

''لکشمی میں صرف تم سے شادی کروں گا''

''ایسا ہو یچ نئیں سکتا۔ تم ایک اچھے خاندان کے مسلمان۔ میرا انا رکشہ چلاتا۔ بھابھی بیڑیاں بناتی ہے۔ نیں۔ ہمارا کوئی جوڑ نیں ہے''

''سب مجھ پر چھوڑ دو۔ میں امّی کو منالوں گا۔ اچھا یہ بتاؤ انا رکشہ کیوں چلاتے ہیں''

''کیا کریں گے ان کو کوئی اور کام آتچ نئیں۔ اماں اور بھابھی سمجھا سمجھا کے تھک گئے۔ نائنا (والد) ہمارے گاوں کے نواب صاحب کے خاص آدمی تھے۔ اماں بولتے کہ نواب صاحب ان پہ بہوت بھروسہ کرتے تھے۔ ان کو ہر جگہ اپنے ساتھ رکھتے تھے۔ پولیس ایکشن میں ہمارا گاوں بہوت متاثر ہوا۔ نواب صاحب کا بنگلہ جلا دیا گیا۔ ان کے اپنے گاوں والے ان پر حملہ کرے تو نواب صاب کا بنگلہ جلا دیا گیا۔ ان کے اپنے گاؤں والے ان پر حملہ کرے تو نواب صاب کو بہوت صدمہ ہوا۔ بعد میں جا گیراں بی ختم ہوگئے۔ پولیس ایکشن کے بعد نواب صاب گھر سے باہر نئیں نکلے ان کا جنازہ ایچ نکلا۔ نائنا بی زیادہ دن زندہ نہیں رہے۔ نائنا کے انتخال کے وخت بہوت چھوٹی تھی۔ ہم لوگاں گھر بیچ کے یہاں آگئے۔ یہاں آنے کے بعد انا رکشہ چلانے لگے۔'' کچھ دیر

خاموشی رہی۔

''آپ لوگوں کو دیکھ کے اماں نواب صاب کے گھر والوں کو بہوت یاد کرتے''

''ہم لوگ کوئی نواب وواب نہیں ہیں'' میں نے کہا۔'' میں شادی کروں گا تو صرف تم سے کروں گا۔شادی کروگی نا مجھ سے؟'' لکشمی اچانک مجھ سے لپٹ گئی۔ بہت دیر تک سینے سے لگی رہی۔

''بس نوکری ہو جانے دو۔ سب کچھ ٹھیک ہو جائے گا' لیکن تمھیں کچھ نہیں ملے گا۔ یہ پیسہ نہ زیور!''

''تمہارے جیسے گورے گورے بچے تو ملیں گے'' لکشمی نے شرارت سے کہا۔

''پوری فوج تیار کردوں گا'' میں نے ہنس کر کہا۔

روزانہ کی طرح اس دن بھی ہم شام کو ملے۔ دیکھا کہ کافی چہل پہل ہے۔ گنے کی فصل کٹ رہی تھی۔ بیل گاڑیوں میں گنا لا اجا رہا تھا۔ میں اور لکشمی الگ الگ راستوں سے ندی کے کنارے پہنچے۔ میں نے ایک گنا اٹھالیا۔ ندی کے کنارے بیٹھ کر ہم گنّا کھانے لگے۔ دنیا بھر کی باتیں کرنے لگے۔ گنا کھانے کے بعد ہم دونوں نے ندی میں اُتر کر ہاتھ دھوے میں نے پانی چاہا تو لکشمی نے روکا۔

''گنا کھانے کے بعد پانی پینے سے زبان کٹ جاتی ہے''۔ میں رک گیا۔ لکشمی کے اس طرح منع کرنے پر مجھے اس پر بے اختیار پیار آیا۔ میں نے اسے اپنی طرف کھینچا اور رہونٹ چوم لیے۔ الگ ہونا چاہا تو ہونٹ ذرا مشکل سے الگ ہوئے۔ گنے کے رس کی وجہ سے ہونٹ چپک گئے تھے۔ دونوں کی ہنسی چھوٹ گئی۔ اس روز ہم دیر تک بیٹھے رہے۔ تا کہ کھیت کی کٹائی کرنے والے لوٹ جائیں۔ ہمارا اندازہ غلط نکلا۔ ابھی ہم نے تھوڑا سا راستہ ہی طے کیا تھا کہ کئی لوگ نظر آئے۔ انھوں نے ہمیں گھیرلیا۔

''کاں سے آرے رے تم لوگاں'' ایک آدمی نے دھمکایا

''جی ندی سے''

''اناانے تر کولڑلو اہے'' انے اور لکشمی دونوں روزیاں آ کے ملتے''

''اے تو بھاگ یہاں سے'' کسی نے لکشمی سے کہا۔ لکشمی چلی گئی

''کیا رے آشنی کرڑا'' ایک آواز آئی۔

''یہ سارے کمینے کالونی میں آ کے بس گئے۔ ان لوگاں بیڑی مزدور بی نئیں ہے''

''کیا رے نظام کا زمانہ سمجھا کیا؟''

''ان کے خون میں عیاشی ہے انا''

''عیاشی ویاشی سب نکال دیں گے''

میرا سر چکرانے لگا۔ بے عزتی اور ذلت کا شدید احساس ہوا۔ سر سے پیر تک پسینہ بہنے لگا۔

''بولتا کیوں نئیں رے''

''مارو سالے کو'' ایک آواز آئی۔ وہ سب اچانک پل پڑے۔ تھپڑ گھونسے لاتیں۔ غنیمت ہے کسی نے لاٹھی کا استعمال نہیں کیا۔ پھر وہ مجھے چھوڑ کر چلے گئے۔ بڑی مشکل سے میں اٹھ پایا۔ ندی پر جا کر منہ دھویا۔ خون صاف کیا۔ سارے کپڑے گندے ہو گئے تھے۔ جسم پھوڑے کی طرح دکھ رہا تھا۔ چپکے سے گھر میں داخل ہوا۔ امّی باورچی خانے میں تھیں۔ کپڑے تبدیل کر لیے۔ امی میرا حلیہ دیکھ کر گھبرا گئیں۔

''کیا ہوا؟''

''سائیکل سے گر پڑا'' میں نے جواب دیا۔

مجھے بہت خوف ہو رہا تھا۔ کالونی میں بات پھیلے گی تو بڑی بدنامی ہوگی۔

---

[1] مسلمان

خاندان بھر میں منہ دکھانے کے قابل نہیں رہوں گا۔ یہ بھی خیال آتا تھا کہ ممکن ہے بات ختم ہو

جائے۔ایک دھڑ کا لگا ہوا تھا۔

دوسرے روز پوری کالونی میں میری پٹائی کی بات پھیل گئی۔بد قسمتی سے اسی روز ضلع میں فساد ہو گیا۔یہ افواہیں گشت کرنے لگیں کہ میری اور لکشمی کی بات کو لے کر یہاں بھی ہنگامہ کیا جائے گا۔تیاریاں کی جا رہی ہیں۔دوسرے محلوں سے غنڈے بلائے جا رہے ہیں۔امی بے حد پریشان تھیں۔انھیں کچھ سمجھائی نہیں دے رہا تھا۔کبھی وہ مجھے ڈانٹنے لگتیں کہ کیوں میں اس حرافہ کی چکر میں پھنس گیا۔کبھی لکشمی کو کوسنے لگتیں۔ان لڑکیوں کا م ہی یہی ہے۔اچھے خاندان کے لڑکوں کو پھنسانا۔کالونی میں ایک سراسمگی پھیل گئی تھی۔مجھے بہت خوف ہو رہا تھا پتہ نہیں کیا ہونے والا ہے؟ شام ماموں نے آکر امی سے بتایا کہ تمام مسلمانوں نے فیصلہ کیا ہے کہ کچھ دنوں کے لیے ضلع کے محفوظ علاقوں میں چلے جائیں۔ جب ہنگامہ تھمے گا تو لوٹ آئیں گے۔امی زیادہ ہی ڈری ہوئی تھیں۔انھوں نے بہن کے گھر شہر جانے کا فیصلہ کیا۔ملیا نے کتنا اصرار کیا کہ وہ بس اسٹاپ پر چھوڑ آئے گا۔امی نہیں مانیں۔ہم کھیتوں سے ہوتے ہوئے بس اسٹاپ پہنچے۔

بہن اور بہنوائی کو امی نے کچھ نہیں بتایا۔بس اتنا ہی کہا کہ حالات پُرسکون ہونے کے بعد ہم لوٹ جائیں گے۔

ہفتہ بھر بعد ماموں کا خط آیا کہ کالونی واپس لوٹنے کی کسی میں ہمت نہیں ہے۔انھوں نے ملیا سے ہمارا سامان بھی منگوالیا ہے۔خط پڑھنے کے بعد امی گم صم ہو گئیں۔اس رات انھیں تیز بخار چڑھا۔رات انھوں نے ضرورت سے اٹھنا چاہا تو اٹھ نہیں سکیں۔صبح ڈاکٹر نے بتایا کہ انھیں فالج ہو گیا ہے۔جسم کا بایاں حصہ متاثر ہوا تھا۔چہرے کا بایاں حصہ‘ ہاتھ اور پیر کام نہیں کر رہے تھے۔

بہنوائی کی کوششوں سے مجھے ان کے آفس میں عارضی کلرکی مل گئی تھی۔جو بھی تنخواہ ملتی اس کا بڑا حصہ امی کے علاج پر لگ جاتا۔امی داماد کے گھر رہنے سے خوش نہیں تھیں لیکن مجبوری تھی۔بہن پر کام کا بوجھ بڑھ گیا تھا۔کبھی کبھی وہ جھنجھلا جاتیں۔بہنوائی نے کبھی اظہار نہیں کیا تھا وہ بھی خوش

نہیں تھے۔ مذاق مذاق میں کہتے کہ امی کی خدمت کرنے کے لیے اب شادی کرلو۔

تین چار برس سے زندگی ایک ہی محور پر گھوم رہی تھی۔ آفس، گھر اور امی کی خدمت! امی کی ذہنی حالت بھی خراب ہوتی جارہی تھی۔ وہ ایک ہی جملہ کہتیں۔

''اپنے گھر چلو''

امی کی اس بات سے بہن بہت چڑ جاتی تھیں۔

مجھے لکشمی کی بہت یاد آتی تھی۔ پتہ نہیں اس پر کیا گذری؟

ایک لمبی کشمکش کے بعد امی کو اس تکلیف دہ صورت حال سے نجات حاصل ہوئی۔ آج فجر کی اذاں کے ساتھ امی نے آخری سانس لی۔ امی نے بہت پہلے کہہ رکھا تھا کہ انھیں ابا کے پہلو میں دفن کیا جائے۔ ہم ضلع کی طرف جارہے تھے۔

ماموں کے گھر پر ویان رکی۔ تمام رشتے دار پہلے ہی سے جمع تھے۔ کچھ لوگوں نے گلے لگا کر آنسو بہائے کچھ لوگوں نے عجیب نظروں سے دیکھا، جیسے امی کی موت کا ذمہ دار میں خود ہوں۔

تدفین کے بعد ہم لوگ ماموں کے گھر رک گئے۔ فاتحہ سیوم کے بعد شہر لوٹنا تھا۔ دل کی کیفیت اور ہی تھی۔ ایک بے چینی سے محسوس ہو رہی تھی۔ امی کے بچھڑنے کا غم! رشتہ داروں کی مشکوک نظریں! لکشمی کے بارے میں جاننے اس سے ملنے کی شدید خواہش رات بھر کروٹیں بدلتا رہا۔ ماموں بہن بہنوائی کی خاطر تواضع اور ان سے باتیں کرنے میں مصروف تھے۔

تیسرے روز فاتحہ پڑھ کر لوٹے تو قبرستان کے پھاٹک پر ملیا نظر آیا۔ کافی کمزور لگ رہا تھا۔

''بابوُ رسائی سچی ہوئی نا؟ (بیگم صاحبہ کا انتقال ہوگیا؟)

''ہاں'' میں نے رندھے ہوئے گلے کے ساتھ کہا۔ مجھے توقع نہیں تھی کہ ملیا سے یوں ملاقات ہوگی۔ ''تمھیں کیسے پتہ چلا؟''

''کل مارکٹ میں آپ کے ماما مل گئے تھے'' وہ امی کو یاد کر کے رونے لگا۔

''ملیا۔ایک بات کہوں؟''

''جی بابو''

''کیا میں وہ گھر دیکھ سکتا ہوں جہاں ہم رہتے تھے''

''کیوں نہیں بابو۔میرے ساتھ چلئے''

میں نے ماموں سے بہانہ کیا۔اور رک گیا۔سب کے جانے کے بعد میں ملیا کے رکشہ میں سوار ہو گیا۔

''تم نے رکشہ چلانا نہیں چھوڑا؟'' میں نے پوچھا۔ملیا کھسیانے انداز میں ہنسنے لگا ادھر کافی عمارتیں تعمیر ہو گئی تھیں۔ریلوے گیٹ بھی تبدیل کر دیا گیا تھا۔سڑک جو سنسان رہا کرتی تھی اس پر چہل پہل نظر آ رہی تھی۔کنکریٹ کی جگہ تارکول کی سڑک بن گئی تھی۔

''کافی رونق ہو گئی ادھر تو''

''ہاں۔آبادی بڑھ گئی ہے''

''پانی کا کنکشن لگ گیا؟''

''ہاں''

''کتنی تکلیف ہوتی تھی کنوئیں سے پانی بھرنے کے لیے'' میں نے کہا

ملیا نے کوئی جواب نہیں دیا۔ہم لوگ کالونی میں داخل ہوئے کئی دکانیں کھل گئی تھیں ایک پرائیوٹ انگلش اسکول کا بورڈ بھی نظر آیا۔مکانات کے اطراف احاطے کی دیواریں اٹھالی گئیں تھیں۔یہ احاطے ہرے بھرے تھے۔پہلی بار مجھے اپنے گھر کے کھونے کا افسوس ہوا۔تین چار برس میں کتنا کچھ بدل گیا تھا۔ملیا نے ہمارے گھر کے سامنے رکشہ روکا۔آنگن میں گوبر کا چھڑکاؤ تھا۔خوب صورت مگو (رنگولی) بنا تھا۔چوکھٹ پر آم کے پتے ایک ڈوری میں پرو کر لٹکا دیئے گئے تھے۔دہلیز پر

نقش ونگار بنے تھے۔

''کون رہتا ہے یہاں؟''

ہم ہی رہتے ہیں۔ہم نے یہ گھر لکشمی کے نام الاٹ کروا دیا''

''اچھا؟'' میرے لہجے میں اتنی تلخی پتہ نہیں کہاں سے آ گئی تھی۔

ملیا نے یا تو اسے محسوس نہیں کیا یا نظرانداز کر گیا۔دروازے کے قریب پہنچ کر ملیا نے تیلگو میں آواز لگائی۔جو عورت باہر آئی وہ لکشمی تھی۔وہی بڑی بڑی آنکھیں، تیکھے نقوش جسم پہلے سے زیادہ بھرا بھرا لگ رہا تھا۔وہ زیادہ خوبصورت ہو گئی تھی۔میں اسے دیکھتا ہی رہ گیا۔لکشمی کے چہرے پر خوشی اور حیرت کے جذبات تھے۔

''آپ؟''اس نے بے ساختہ کہا

''اندر آ جایے۔''ملیا نے کہا میں ابھی آیا ملیا شاید ہمیں تنہائی میں بات کرنے کا موقع دینا چاہتا تھا۔لکشمی نے ایک فولڈنگ چیر لگا دی۔خود فرش پر بیٹھ گئی۔

''انا نے آپ کی امی کے بارے میں بتایا۔افسوس ہوا''

''اپنا گھر کھونے کے غم میں ایسے بیمار پڑیں کہ.....'' میرا گلہ بھر آیا

لکشمی نے سر جھکا لیا۔اس کی آنکھوں سے بھی آنسو بہنے لگے۔ایک تکلیف دہ خاموشی چھا گئی۔

''ہمارے جانے کے بعد تمھارے ساتھ کیا ہوا؟''

''کچھ نہیں۔وہ تو مسلمانوں کو یہاں سے بھگانے کا بہانہ تھا۔فساد بھی نہیں ہوا یہاں۔البتہ اماں میری شادی کی جلدی کرنے لگی''

''شادی ہو گئی تمھاری''

''ہاں''

مبارک ہو‘‘ میرے لہجے میں پھر وہی تلخی عود کر آ گئی کب ہوئی ؟‘‘

آپ لوگوں کے جانے کے ایک سال بعد..... اماں‘ انا کے پیچھے پڑ گئی تھی۔

’’کیا کرتے ہیں تمھارے میاں؟‘‘

’’کھیتاں اور زمیناں تھے۔‘‘

’’تھے کیا مطلب؟‘‘

’’میرے کو چھوڑ دیے انوں۔‘‘

’’ارے کیوں؟‘‘ مجھے یقین تھا اس کی وجہ ہمارا عشق ہی ہوگا۔ ’’کیا بات ہوئی؟‘‘

’’بچے کی وجہ سے‘‘

کیا انہیں بچے کی شدید خواہش تھی اور تم ماں نہ بن سکیں؟‘‘

’’نیں۔ ایک بچہ ہے میرا‘‘ لکشمی چپکے چپکے رونے لگی۔ میری سمجھ میں نہیں آر ہا تھا کہ کیا کہوں۔ تب ہی ملیا اندر آیا۔ اس کی گود میں ایک خوب صورت لڑکا تھا۔ گورا رنگ‘ سیاہ آنکھیں‘ گھنگھریالے بال!

’’بڑا پیارا بچہ ہے۔ ادھر آؤ بیٹا‘‘ میں نے بے اختیار کہا۔ ملیا نے اسے تیلگو میں سمجھایا کہ میرے پاس جائے۔ لڑکا چپ چاپ میرے پاس آ گیا۔

’’کس کا لڑکا ہے؟‘‘ میں نے پوچھا۔

’’لکشمی کا‘‘ ملیا نے دھیرے سے کہا۔ میں چونک پڑا۔

’’آپ کو یقین نئیں آیا نا؟‘‘

’’نہیں۔ میرا مطلب ہے‘‘ میں گڑ بڑا گیا۔

’’کوئی بی تخین نہیں کرتا۔ اماں‘ ودنا (بھابھی) رشتے دار‘ کالونی والے۔ کوئی تخین نئیں کرتا۔ ان کو بھی تخین نہیں آیا۔ سب میرے پہ شبہ کرتے ہیں۔‘‘

’’کیا شبہ کرتے ہیں؟

''یہ کہ۔ لکشمی لمحے بھر کو رکی۔ اس کو سب آپ کا بچہ سمجھتے ہیں''، لکشمی نے جلدی سے کہا۔

ملیا باہر چلا گیا۔

''لیکن لکشمی تم جانتی ہو ہمارے درمیان ایسا کچھ بھی نہیں ہوا''میں نے سٹپٹا کر کہا۔

''ہاو۔ مگر کوئی ماننے کو تیار اچ نئیں ہے قسماں کھا کھا کے تھک گئی۔ ان سے کتنا آجزی کی۔ نئیں مانے' آخر چھوڑ دیا ہم کو۔ الگ ہو گئے۔ لکشمی رونے لگی۔''بڑی بے غیرتی کی زندگی ہے۔ انا اور یہ بچہ نئیں ہوتا تو باؤلی [1] میں کود کے مر جاتی۔''

میں سناٹے میں آ گیا۔

قارئین! کہانی کا ایک انجام تو یہ ہو سکتا ہے کہ میں کسی جھمیلے میں نہ پڑ کر فرقہ وارانہ کشیدگی کا خطرہ مول لے بغیر لکشمی کو دلاسہ دے کر چپ چاپ یہاں سے چلا ؤں۔ لکشمی کو بھلا کر ایک نئی زندگی کا آغاز کروں۔

دوسرا انجام یہ ہو سکتا ہے کہ میں لکشمی اور اس کے بچے کو اپنا لوں۔ لکشمی کو میں نے چاہا ہے۔ وہ میری پہلی محبت ہے۔ امی کے انتقال کے بعد میں بالکل تنہا ہو گیا ہوں۔ میں کسی کو جواب دہ بھی نہیں ہوں۔ ہم دونوں کہیں دور چلے جائیں اور اپنی مرضی سے زندگی گزاریں۔

---

[1] کنواں

☆☆☆